ماہنامہ

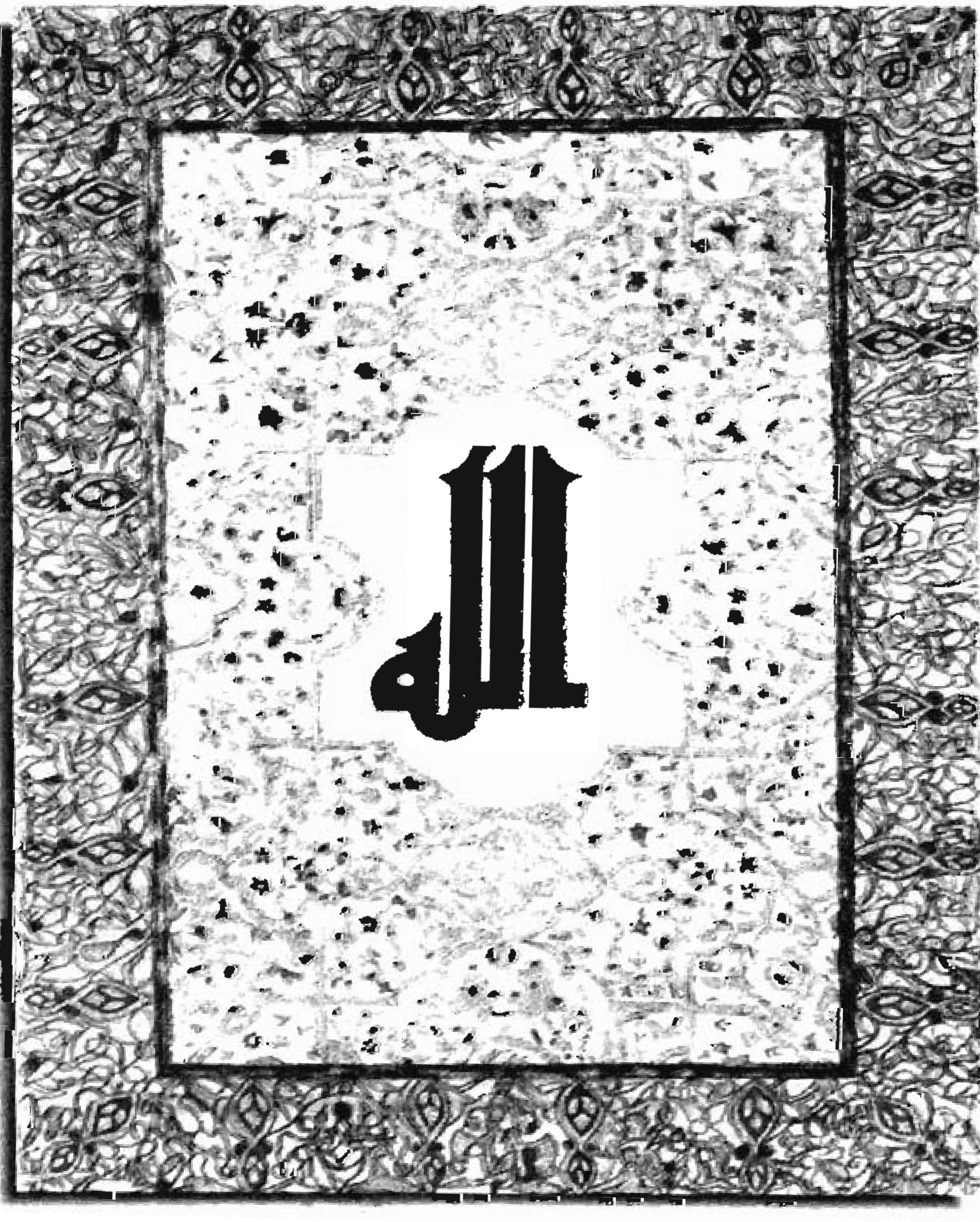
ترجمان القرآن

جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مُدیر

خورشید احمد



ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: خورشید احمد — نائب مدیر: مسلم سجاد

جلد ۱۲۴ — اکتوبر ۱۹۹۷ء، جمادی الثانی ۱۴۱۸ — عدد ۱۰

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰

فون: ۷۸۴۴۶۰۵

فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴

انتظامی امور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون: ۷۵۸۷۹۱۶ - ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ ۱۵ روپے

زرسالانہ ۱۵۰ روپے

بھارت -/۳۰۰

بنگلہ دیش، ایران -/۴۵۰

مشرق وسطیٰ، یورپ،

مشرق بعید، افریقہ -/۶۵۰

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا -/۹۰۰

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

۶۰ سال پہلے

ترکی، ایران اور عراق ترقی کے قدم نسبتاً آگے بڑھا چکے ہیں، لیکن اس طرح کہ گویا مذہب اور دنیوی زندگی کی راہیں الگ الگ ہیں۔ افغانستان اور مصر کا تیوز بھی کچھ یہی کہہ رہا ہے۔ ان اسلامی ممالک میں تقلید یورپ اور اتباع مذہب دونوں کا تصادم ہو رہا ہے۔ لیکن حالات سے ہر باخبر انسان بخوبی جانتا ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن، اسلامی تمدن، کلچر، اصول و معاشرت، اور طرز حکومت پر کس طرح غالب ہوتا جارہا ہے۔ پھر اگر ان ممالک نے ترقی کی معراج حاصل کر بھی لی تو اللہ اور رسول کی نظروں میں اس عزت اور ترقی کی کیا حیثیت ہو گی؟ کیا یہ اسلامی حکومت کہی جائے گی؟ کیا خلافت الٰہی کا کھویا ہوا تاج و تخت انھیں حاصل ہو جائے گا؟ کیا اس وقت انھیں تائید الٰہی حاصل ہو جائے گی؟ کیا وہ اَلَا اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ کے مصداق ہو جائیں گے؟ کیا وہ متقین اور صالحین کی وہ جماعت بن جائیں گے جن کی نصرت کے لیے ملائکہ نازل ہوا کرتے تھے؟ اگر ایسا نہ ہو گا اور یقیناً نہ ہو گا تو ہمارے قائدین ملت کو وقت کی نزاکت کا احساس کرنا چاہیے۔ اگر پوری امت اسی سیلاب کی رو میں بہہ گئی تو پھر نہایت ہی ماتم کا وقت ہو گا۔ اس وقت امت کا خدا سے رہا سہا رشتہ بھی منقطع ہو جائے گا۔ خطرہ ہے پھر معلوم نہیں ان خوفناک فتنوں کا قدرت کیا جواب دے؟ اسلام کے دردمندوں کو چاہیے کہ ان فتنوں کے مقابلے کے لیے بشرطیکہ انھیں اپنی مسئولیت اور ذمہ داری کا کچھ بھی ڈر ہو، خانقاہوں کی ہوا اور مدرسوں کے حجروں سے باہر نکلیں۔ کتاب الٰہی کی روشنی میں منزل مقصود کو تلاش کریں۔ امت کی شیرازہ بندی اور قوم کی مکمل تنظیم کا ہر ممکن طریقہ اختیار کریں، اور ان مفاسد کا سب سے پہلے سدباب کریں جو اختلاف و نزاع کے جراثیم پیدا کر کے وحدت امت کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں۔

پھر رفتہ رفتہ ان کے ظاہر و باطن پر پڑے ہوئے غلاف ضلالت کو اٹھایا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے اتنے عظیم الشان انقلاب کا مطلب قوم کو بالکل نئے سانچے میں ڈھالنا ہو گا جس کے لیے کافی غور و فکر کے ساتھ کافی حزم و احتیاط اور عزیمت و استقلال کی ضرورت ہو گی۔

(ترجمان القرآن، صدر الدین اصلاحی، مسلمان اور امامت کبریٰ، جلد ۱۱، عدد ۲، شعبان ۱۳۵۶ھ / اکتوبر ۱۹۳۷ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

قومی دفاعی پالیسی : اصول اور اہداف

خورشید احمد

دفاعی پالیسی کا اولیں مقصد قومی سلامتی ہے جو ملک و ملت کے آزاد وجود اور ان کی بنیادی اقدار' اداروں اور حقیقی مفادات کے ملکی اور معیاری تحفظ سے عبارت ہے۔ یہ کیفیت صرف اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب ایک قوم اپنے اندر اتنی قوت اور صلاحیت رکھتی ہو کہ سلامتی کو پیش آنے والے اندرونی اور بیرونی خطرات کا بھرپور اور مردانہ وار مقابلہ کر سکے' بلکہ اس کی قوت اور تیاری اس سطح کی ہو کہ دشمن پر ایک خوف کی کیفیت طاری ہو جائے اور وہ جارحیت کی ہمت نہ کر سکے۔ اس صلاحیت کا نام جدید عسکری فکر میں سدِّ جارحیت(deterrence) ہے یعنی مقابلے کی ایسی قوت جو دشمن کے جنگی عزائم کے لیے لگام کا کام کرے اور اسے یہ یقین ہو جائے کہ اگر اس نے کسی جارحیت کا ارتکاب کیا تو ایسی جوابی چوٹ پڑے گی جو اس کے لیے قابل برداشت نہ ہو گی۔ جنگ دراصل ان حالات میں ہی رونما ہوتی ہے' جب ایک فریق کو یہ اندازہ ہو کہ وہ دوسرے پر بہ آسانی غالب آ سکتا ہے: ع

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

مقابلے کی قوت ہی میں جنگ سے محفوظ رہنے کی ضمانت ہے۔ قومی سلامتی کے موضوع پر لکھنے والے اس کلیہ کے بارے میں متفق ہیں کہ تاریخ کے ہر دور میں' اور خاص کر آج کے دور میں امن و آشتی کا حصول اور آزادی اور سلامتی کا تحفظ' مقابلے کی قوت ہی کا رہین منت ہے۔ جو قوم اپنی آزادی' اپنے قومی آدرش اور اپنی اقدار کی حفاظت کی قوت' عزم اور غیرت نہ رکھتی ہو وہ بالآخر دوسروں کی محکوم اور ان کی باجگزار بن جاتی ہے' گو بظاہر اس کا اپنا جھنڈا ہو اور اس کے کارفرما کروفر کا مظاہرہ بھی کر رہے ہوں۔ مشہور سیاسی مفکر والٹر لپ مین نے قومی سلامتی کے بارے میں انسانی فکر کا خلاصہ یوں بیان کیا ہے:

A nation has security when it does not have to sacrifice its legitimate interest to avoid war, and is able, if challenged, to maintain them by war". (Encyclopaedia of Social Sciences 1968).

ایک قوم کی قومی سلامتی اسی وقت محفوظ رہ سکتی ہے جب وہ اس پوزیشن میں ہو کہ جنگ سے بچنے کے لیے اپنے جائز مفادات کو قربان کرنے پر مجبور نہ ہو' اور اگر ان مفادات کو کوئی خطرہ ہو تو وہ اتنی طاقت رکھتی ہو کہ جنگ کے ذریعے ان کا دفاع کر سکے۔

عالمی سیاست اور تاریخ صلح و جنگ کی روشنی میں یہ ہے قومی سلامتی اور اس کے تحفظ کا زریں اصول۔ آیئے دیکھیں کہ اللہ جَلّ جَلالہ نے قرآن پاک میں مسلمانوں کو اپنی قومی سلامتی کے تحفظ کے لیے کیا تعلیم دی ہے۔ فرمایا:

وَاَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ - اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (الانفال ۸ : ۶۰)

اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے' زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لیے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعدا کو خوف زدہ کر دو جنھیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدل تمہاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمہارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہو گا۔

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس سے مطلب یہ ہے کہ تمہارے پاس سامان جنگ اور ایک مستقل فوج (standing army) ہر وقت تیار رہنی چاہیے تاکہ بوقت ضرورت فوراً جنگی کارروائی کر سکو۔ یہ نہ ہو کہ خطرہ سر پر آنے کے بعد گھبراہٹ میں جلدی جلدی رضاکار اور اسلحہ اور سامان رسد جمع کرنے کی کوشش کی جائے اور اس اثنا میں کہ یہ تیاری مکمل ہو' دشمن اپنا کام کر جائے"۔ (تفہیم القرآن' جلد ۲' ص ۱۵۵)

مولانا امین احسن اصلاحی ایک دوسرے پہلو کو نمایاں کرتے ہیں:

"رباط الخیل سے مراد وہ گھوڑے ہیں جو خاص جنگ کے لیے تربیت دیے جائیں اور اسی غرض کے لیے محفوظ اور تیار رکھے جائیں۔ جنگ میں ہر قسم کے گھوڑے کام نہیں آتے۔ اس زمانے کی جنگ میں گھوڑوں ہی کی اصل اہمیت بھی تھی اور عرب کی مخصوص آب و ہوا کے لحاظ سے ان کے ہاں گھوڑوں کی تربیت کا خاص اہتمام بھی تھا۔ اسی چیز کی ہدایت یہاں مسلمانوں کو کی گئی ہے کہ جہاد کے لیے قابل جہاد لوگوں کو بھی منظم کرو اور تربیت دیے ہوئے گھوڑے بھی تیار رکھو...... اس آیت میں

مسلمانوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ اپنی فوجی قوت، نفری کے اعتبار سے بھی اور اسلحہ و اسباب جنگ کے اعتبار سے بھی، زیادہ سے زیادہ بڑھائیں۔ اس زمانے کی جنگ میں گھوڑوں کو وہی اہمیت حاصل تھی جو اس زمانے میں ٹینک اور ہوائی جہاز کو حاصل ہے۔ جنگ بدر میں مسلمانوں کے ساتھ گھوڑے بہت کم تھے۔ آگے کے مراحل میں ان کی تعداد زیادہ کرنے کی تاکید ہوئی۔ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ یہ اس تیاری کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ کے اور تمھارے دشمنوں پر تمھاری دھاک اور ہیبت قائم رہے کہ تمھیں نرم چارہ سمجھ کر وہ تم پر حملہ کرنے کی جرات نہ کریں...... وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ... الایہ یہ جنگی تیاریوں کے سلسلے میں انفاق کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے کہ اس مقصد کے لیے جو کچھ بھی خرچ کرو گے تمھارا کوئی دھیلا پیسہ بھی ضائع جانے والا نہیں ہے"۔ (تدبر قرآن، جلد سوم، ص ۹۳-۹۴)

مفتی محمد شفیعؒ بڑے واضح الفاظ میں لکھتے ہیں:

"یعنی سامان جنگ کی تیاری کرو کفار کے لیے جس قدر تم سے ہو سکے...... اس کے بعد اس سامان کی کچھ تفصیل اس طرح فرمائی: من قوۃ یعنی مقابلے کی قوت جمع کرو۔ اس میں تمام جنگی سامان، اسلحہ، سواری وغیرہ داخل ہیں، اور اپنے بدن کی ورزش، فنون جنگ کا سیکھنا بھی۔ قرآن کریم نے اس جگہ اس زمانے کے مروجہ ہتھیاروں کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ قوت کا عام لفظ اختیار فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ یہ قوت ہر زمانے اور ہر مقام کے اعتبار سے مختلف ہو سکتی ہے۔ اس زمانے کے اسلحہ تیر، تلوار، نیزے تھے۔ اس کے بعد بندوق توپ کا زمانہ آیا۔ پھر اب بموں اور راکٹوں کا وقت آگیا۔ لفظ قوت اس سب کو شامل ہے اس لیے آج کے مسلمانوں کو بقدر استطاعت ایٹمی قوت، ٹینک اور لڑاکا طیارے، آب دوز کشتیاں جمع کرنا چاہیے کیونکہ یہ سب اس قوت کے مفہوم میں داخل ہیں، اور اس کے لیے جس علم و فن کو سیکھنے کی ضرورت پڑے وہ سب اگر اس نیت سے ہو کہ اس کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کے دفاع کا اور کفار کا مقابلہ کرنے کا کام لیا جائے گا تو وہ بھی جہاد کے حکم میں ہے...... جنگی سامان جمع کرنے اور جنگ کرنے میں ضرورت مال کی بھی پڑتی ہے بلکہ سامان جنگ بھی مال ہی کے ذریعے تیار کیا جا سکتا ہے اس لیے آخر آیت میں اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی فضیلت اور اس کا اجر عظیم اس طرح بیان فرمایا کہ اس راہ میں تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدلہ تمھیں دے دیا جائے گا"۔ (معارف القرآن، جلد چہارم، ص ۲۷۲-۲۷۴)

ان آیات مبارکہ پر تدبر کرنے سے چار اصول اور اہداف ہمارے سامنے آتے ہیں:

اول: اہل ایمان کے لیے ضروری ہے کہ دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہیں۔ اس سلسلے میں کسی قسم کی غفلت کا کوئی جواز نہیں، بلکہ یہ غفلت بڑی مہنگی پڑ سکتی ہے۔

دوم: جنگی تیاری جن چیزوں سے عبارت ہے' ان میں فوج کی عددی قوت' مقابلے کا سامان جنگ اور حربی مہارت' سرعت سے نقل و حرکت کی صلاحیت اور ہر نوع کے سامان رسد کی فراہمی ہے۔ ان چیزوں کا اہتمام اپنے وقت کی ٹیکنالوجی اور مدمقابل کی جنگی صلاحیت کی مناسبت سے کیا جانا چاہیے۔

سوم: یہ تمام تیاری کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے اتنی ہونی چاہیے کہ ایک طرف تمھاری استطاعت سے مناسبت رکھتی ہو تو دوسری طرف اتنی موثر ہو جو مخالف کو خائف کرنے اور اسے جارحیت سے باز رکھنے والی ہو۔ اس چیز کو جنگی اصطلاح میں مقابلے کی قوت یا سد جارحیت کہا جاتا ہے۔

چہارم: اس پورے عمل کے لیے مالی اور مادی قربانی ناگزیر ہے۔ جس طرح مسلمان کی جان پر اللہ کا حق ہے اسی طرح اس کے مال پر اللہ کا حق ہے--- اور جہاد فی سبیل اللہ اور مسلمانوں کے دفاع کے لیے جو بھی حقیقی مادی اور مالی ضرورت ہے' اسے پورا کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ انھیں نہ مقابلے کی قوت کے حصول میں کوتاہی کرنی چاہیے اور نہ اس سلسلے میں مالی قربانی سے دریغ کرنا چاہیے۔ ان کے مال کا بہترین مصرف ذاتی تعیش اور زیبائش نہیں' اللہ کے دین اور مسلمانوں کے وطن کا دفاع اور معاشرے کے غریب اور محروم طبقات کی مدد ہے تاکہ وہ زندگی کی بنیادی ضروریات سے شاد کام ہو سکیں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ۔ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ۔ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ (سورہ الصف ۶۱: ۱۰-۱۱)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو' میں بتاؤں تم کو وہ تجارت جو تمھیں عذاب الیم سے بچا دے؟ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولؐ پر' اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے' یہی تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو---

اور فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (المعارج ۷۰: ۲۴-۲۵)'

ان کے مال میں ایک جانا بوجھا حق ہے' مانگنے والے اور محروم کے لیے۔

پاکستان کی دفاعی پالیسی کے اصول اور اہداف کا تعین انھی قرآنی احکام اور تاریخی حقائق کی روشنی میں ہونا چاہیے۔

بلاشبہ ہماری داخلہ اور خارجہ پالیسیوں کا اصل مقصد ایمان' آزادی اور قومی سلامتی کا تحفظ' اور عزت و وقار اور امن و آشتی کے قیام کے لیے حالات کو سازگار بنانا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب ایک طرف عالمی حالات اور فوری خطرات کا صحیح ادراک (threat perception) ہو اور دوسری طرف قوم کو اخلاقی' مادی اور عسکری طور پر مقابلے کی قوت سے آراستہ کیا جائے۔

اشتراکیت کے زوال کے بعد مغربی اقوام نے نہایت عجلت اور عاقبت نااندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، عالم اسلام کو بالعموم اور اسلامی احیا کی قوتوں کو بالخصوص ایک خطرے کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیا ہے اور دانش وروں سے لے کر سیاست دانوں، فوجی ماہروں اور میڈیا کے ناخداؤں تک ہر کوئی اس "مقدس جنگ" میں مصروف ہے۔ گویا نئی صلیبی جنگوں کے لیے فضا بنائی جا رہی ہے۔ اس تناظر میں امریکہ اور مغربی اقوام کا اسرائیل اور بھارت سے، جو اپنے اپنے جارحانہ عزائم رکھتے ہیں، عرب دنیا، ایران اور پاکستان کے خلاف گٹھ جوڑ وجود میں آ رہا ہے۔ اسرائیل کا تو قیام ہی عالم اسلام کے قلب میں خنجر گھونپنے کے مترادف تھا۔ پھر اسے جدید ترین آلات جنگ اور ایٹمی ہتھیاروں سے مسلح کیا گیا اور دھونس اور قوت کے ذریعے پورے علاقے پر اس کی بالادستی قائم کی گئی ہے۔

بھارت کو بھی جو پہلے دن سے علاقے کی سوپر پاور بننے کے خواب ہی نہیں دیکھ رہا بلکہ اس کی عملاً تیاری بھی کر رہا ہے، امریکہ، مغربی اقوام اور اسرائیل کی مکمل تائید حاصل ہے۔ صدر کارٹر نے ۱۹۷۸ء میں بھارتی پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے اس امریکی پالیسی کا صاف لفظوں میں اعلان کیا تھا، حالانکہ اس وقت بھارت روس کا ہم سفر تھا اور ابھی امریکہ واحد سوپر پاور نہ بنا تھا:

> "امریکہ عالمی سوپر پاورز میں سے ایک ہے۔ بھارت غیروابستہ ممالک میں سب سے بڑا ملک ہے۔ ہم میں سے ہر ایک دوسرے کے عالمی کردار کے تصورات کا احترام کرتا ہے"۔ (بحوالہ Shelton Kodikare کی کتاب Factors in Interstate Relations in South Asia, Canberra, 1979, p -45.)

امریکہ کی علاقے کے بارے میں پالیسی کا تجزیہ ہمیں یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ امریکہ نے پاکستان سے اپنی نام نہاد دوستی کا پورا پورا فائدہ اٹھایا لیکن علاقے کی بڑی طاقت کے طور پر بھارت کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی کی اور پاکستان پر دباؤ ڈالا اور ڈال رہا ہے کہ بھارت کی اس بالادستی کے آگے سر ڈال دے۔

اس دباؤ کو بڑھانے کے لیے بھارت اور اسرائیل میں اسٹرے ٹیجک تعاون گذشتہ چالیس سال سے برابر بڑھ رہا ہے۔ اور یہ تعاون حساس جاسوسی معلومات (sensitive intelligence information) سے لے کر اسلحے کی تجارت، مشترک فوجی مشقوں اور کمانڈو کارروائیوں تک پہنچ چکا ہے۔ اسرائیل کے وزیر دفاع اور اعلیٰ فوجی افسران بھارت کے علاقائی منصوبوں کے بنانے میں برابر شریک رہے ہیں۔ کشمیر، پنجاب اور دوسرے علاقوں میں بھارت کی فوجوں کی مدد اسرائیلی مشیر کر رہے ہیں اور پاکستان کے خلاف شرانگیز منصوبوں میں اسرائیل کی شرکت برابر بڑھ رہی ہے۔ اس سلسلے میں سیمون ہرش (Seymon Hersh) نے اپنی عالمی شہرت یافتہ کتاب The Samson Option میں، جس میں اسرائیل کی نیوکلیر تیاری کی کہانی تفصیل

سے بیان کی گئی ہے، اس امر کا اظہار بھی کیا ہے کہ پاکستان میں کہوٹہ کی ایٹمی تنصیبات کو تباہ کرنا بھی اسرائیلی منصوبوں میں شامل ہے۔

اس پس منظر میں پاکستان کے لیے ضروری ہے کہ اس کی دفاعی صلاحیت اتنی ہو جو نہ صرف بھارت اور اسرائیل سے پیش آنے والے خطرات کا موثر مقابلہ کرنے کے لیے کافی ہو بلکہ جس کی وجہ سے انھیں کسی جارحیت کے ارتکاب کی ہمت ہی نہ ہو سکے۔ خطرات کے اس تناظر میں اصل چیز فوج کی تعداد یا روایتی اسلحے کی مقدار نہیں بلکہ مقابلے کی وہ قوت ہے جس سے دشمن کے دانت کھٹے کیے جا سکیں۔

خلیج کی جنگ نے روایتی جنگی سازوسامان کی محدودیت (limitations) کو بالکل طشت ازبام کر دیا ہے۔ گہری نظر رکھنے والے فوجی مبصر تو پہلے بھی یہ بات کہتے تھے لیکن ۱۹۹۱ کے خلیجی معرکے کے بعد تو اب اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ اگر آج پاکستان کے دفاع کے لیے کوئی چیز سب سے زیادہ موثر ہو سکتی ہے تو وہ نیوکلیر مسدود جارحیت (deterrent)، درمیانی مار کے میزائل اور موثر فضائی قوت ہے۔ ایک حد تک روایتی جنگی صلاحیت کی بھی ضرورت ہے لیکن اب اتنی بڑی روایتی جنگی مشینری ضروری نہیں جتنی چند عشرے پہلے تھی۔ روایتی جنگی مشینری میں ایسی تخفیف ممکن ہے جو جنگی صلاحیت کو کم کیے بغیر پورے نظام کو زیادہ بہتر اور موثر کر دے، البتہ مقابلے کی قوت ضروری ہے جس کے معنی مساوی نہیں صرف اس تناسب سے صلاحیت کی موجودگی ہے جو دشمن کے پہل کرنے کی صورت میں بھی اس کو ناقابل برداشت نقصان پہنچا سکتی ہے۔ یہی صلاحیت بھارت کے جنگی عزائم کو نکیل ڈال سکتی ہے۔ اگر یہ صلاحیت ۱۹۷۱ میں پاکستان کو حاصل ہوتی تو بھارت کبھی مشرقی پاکستان پر حملہ کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا، جس کا اعتراف تمام جنگی ماہرین آج کر رہے ہیں۔ خود بھارت کے بری فوج کے سابق کمانڈر جنرل کرشنا سوامی سندر جی (Sundurji Krishnaswami) نے ۱۹۴۸، ۱۹۶۵ اور ۱۹۷۱ کی جنگوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ اگر بھارت اور پاکستان کے پاس نیوکلیر صلاحیت ہوتی تو یہ جنگیں ہرگز واقع نہ ہوتیں۔

These wars would have not occured.

(بحوالہ سندر جی کا مضمون: The Relevance of Nuclear Weapons جو کتاب Changing Military Equations in Asia میں شائع ہوا ہے)۔

اسی حقیقت کا اعتراف جنرل اسلم بیگ نے کیا ہے کہ "یہ صرف نیوکلیر مُسدوّ جارحیت ہے جس کی وجہ سے جنوب ایشیا جنگ سے محفوظ رہا ہے" اور اگر یہ صلاحیت پہلے ہوتی تو "پاکستان کے منقسم ہونے کا حادثہ نہ ہوتا"۔

جنرل سندر جی نے India Today (اپریل ۳۰، ۱۹۹۳) میں کہا ہے کہ "اگر بھارت اور پاکستان میں

نیوکلیر مسدد جارحیت موجود ہے تو مجھے یقین ہے کہ پھر دونوں ملکوں میں ان کی اپنی اپنی روایتی افواج میں کمی ممکن ہو سکے گی"۔

حالات کے اس تجزیے سے چند نتائج سامنے آتے ہیں جو پاکستان کی دفاعی پالیسی کے لیے رہنما اصول اور ناگزیر اہداف کی حیثیت رکھتے ہیں:

۱- ہماری دفاعی پالیسی کی بنیاد دین اور وطن کا تحفظ ہونا چاہیے۔ جذبہ جہاد ہی وہ سب سے موثر قوت ہے جو نسبتاً چھوٹے ممالک کو بھی بڑے اور طاقتور ممالک کے مقابلے میں تحفظ فراہم کر سکتا ہے۔ یہ اصول قرآن و سنت سے ثابت ہے اور پوری اسلامی تاریخ بھی اس پر گواہ ہے۔ بلکہ پاکستان نیوی کے سابق سربراہ ایڈمرل شریف نے تو انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے ایک سیمینار میں یہ شہادت بھی پیش کی تھی کہ جب وہ بحری فوج کے سربراہ کے ساتھ ایک وفد میں چین کے وزیراعظم چو این لائی سے ۱۹۶۸ میں ملے تھے تو اس گفتگو کے دوران چو این لائی نے کہا تھا کہ پاکستان کے دفاع کا راز جہاد کو زندہ رکھنے میں ہے (Foreign Policy Debate p 152)

۲- پاکستان کے لیے نیوکلیر صلاحیت کو اس سطح پر قائم رکھنا ضروری ہے جو علاقے میں جنگ کے لیے موثر مسدد جارحیت ہو۔ اس کے لیے بھارت یا اسرائیل سے مساوات ضروری نہیں۔ صرف اتنی صلاحیت ضروری ہے جو دشمن کو حملے سے روکنے کے لیے کافی ہے۔ اسے ہر قیمت پر برقرار رکھنا ہماری آزادی اور دینی تشخص کے تحفظ کے لیے ناگزیر ہے۔ اسی طرح موثر ترسیلی نظام (delivery system) کی موجودگی اس کا ایک حصہ ہے۔ قریبی اور درمیانی مار کے میزائل اور اچھی فضائیہ اس نظام کا ضروری حصہ ہیں۔ نیز ایک مختصر مگر موثر بحریہ کی ضرورت ہے جو نیوکلیر صلاحیت سے لیس ہو اور ہمارے سمندروں کی حفاظت کر سکے۔

۳- اس فریم ورک میں فوج کی تنظیم نو ضروری ہے تاکہ روایتی جنگی مشینری کو حقیقی ضرورت کی سطح پر زیادہ سے زیادہ اچھی کارکردگی اور اعلیٰ تربیت کے ساتھ برقرار رکھا جاسکے۔

۴- دفاعی صنعت اور دفاعی تحقیق کا موثر نظام ہونا چاہیے جو ملک میں اور مسلمان دنیا میں خود کفالت (self-reliance) پیدا کر سکے۔

۵- آبادی کے تمام صحت مند افراد کو مناسب فوجی تربیت دی جائے تاکہ یہ رضاکار فورس دفاع کی ایک موثر دوسری لائن بن سکے۔ اس وقت ترکی اور مغرب کے بیشتر ممالک میں ہر نوجوان کے لیے بنیادی فوجی تربیت لازمی ہے۔ سوئٹزرلینڈ اور اسرائیل نے تو دفاعی نظام ہی اس طرح مرتب کیا ہے کہ ایک طرف مختصر لیکن نہایت اعلیٰ تربیت یافتہ اور جدید ترین اسلحہ سے لیس فوج ہے تو اس کی پشت پر فوج سے ۴ سے ۶

گنا بڑی قومی رضاکاروں کی تعداد ہے جو ایک ہفتے کے بلاوے پر عام جنگی ذمہ داریاں سنبھالنے کی پوزیشن میں آسکتی ہے اور اس طرح فوج زیادہ ترقی یافتہ اور ماہرانہ (sophisticated) کردار کے لیے مخصوص رہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان میں اس نوعیت کا نظام قائم نہ کیا جا سکے۔ افغانستان اور کشمیر کے جہاد نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہمارا عام نوجوان بھی ضروری تربیت کے بعد بڑے بڑے فوجی سورماؤں کے چھکے چھڑانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

۶۔ ملکی معیشت کا استحکام اور خصوصیت سے غذائی پیداوار میں خود کفالت بھی قومی دفاع ہی کا ایک پہلو ہے۔ کیا ستم ہے کہ بھارت کی فوجیں صرف کشمیر ہی میں ہمارے بھائیوں اور بہنوں کا خون نہیں بہا رہی ہیں بلکہ خود ہماری سرحدوں پر روز حملے ہو رہے ہیں اور خون ناحق بہایا جا رہا ہے اور اس باغیرت قوم کے نام نہاد لیڈر بھارت سے تجارت کی پینگیں بڑھا رہے ہیں اور گندم اور اشیائے خوردنی تک کی درآمد کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!

۷۔ ملک میں امن و امان کی صورت حال کو بہتر بنانا اور ملت کے ہر مرد و زن کو شہری دفاع کے لیے تیار کرنا چاہیے۔

۸۔ قوم کی اخلاقی تربیت اور اس کی دینی اقدار، تہذیبی روایات اور تمدن و ثقافت کے تحفظ کے لیے اقدامات کرنا چاہییں۔ نیز صحت مند متبادل ثقافتی سرگرمیوں کے فروغ کے ذریعے ہندو کلچر اور مغربی تہذیب و ثقافت کی یلغار سے بچانے کی تدابیر بھی ضروری ہیں۔

یہ ہیں وہ رہنما اصول اور بنیادی اہداف، جن کا حصول ہمارا قومی دفاعی پالیسی کا اصل مقصد ہونا چاہیے۔ انھی کے ذریعے ہم اپنے دین اور اپنے وطن کی حفاظت کا فرض ادا کر سکیں گے اور امت مسلمہ کی عزت و آبرو پر کبھی کوئی حرف نہ آنے دیں گے۔ ان شاء اللہ!

البتہ ایک سوال باقی رہتا ہے جس کا جواب ضروری ہے: اس پر عمل کرنے کے لیے وسائل کہاں سے حاصل کیے جائیں؟ ہمیں اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ پاکستان اور امت مسلمہ کے پاس وافر وسائل موجود ہیں۔ اصل مسئلہ ان وسائل کے صحیح استعمال اور ان پر تصرف کا اختیار رکھنے والوں کی اصلاح یا تبدیلی ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل امور قابل غور ہیں:

اول: مضبوط عزم اور درست وژن۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے قوت کی تیاری کے ساتھ انفاق اور اس کی بار آوری کا ذکر کیا ہے۔ قیادت اور قوم دونوں کو اس بارے میں یکسو ہونا چاہیے کہ سلامتی اور قومی دفاع کے لیے وسائل کی فراہمی ہماری اولیں ضرورت ہے۔

دوم : ملک کی معاشی حکمت عملی اور ترقی کے منہج اور ترجیحات کی یکسر تبدیلی۔ مضبوط، صحت مند، اسراف و تبذیر سے پاک اور منصفانہ معیشت کے بغیر کوئی قوم اپنی سیاسی آزادی اور تہذیبی تشخص کو باقی نہیں رکھ سکتی ہے۔ قرضوں کی معیشت، تعیش کی معیشت، کرپشن کی معیشت، محض چند ہزار خاندانوں کو امیر بنانے والی معیشت، زراعت اور عام آدمی کی ضرورتوں کو نظرانداز کرنے والی معیشت کبھی بھی انسانوں کو حقیقی خوش حالی سے شاد کام نہیں کر سکتی اور نہ ہی ان کو سیاسی اور عسکری اعتبار سے مضبوط کرنے کے لیے مناسب بنیاد فراہم کر سکتی ہے۔ قناعت، کفایت شعاری اور قومی اور دینی ترجیحات کے مطابق زندگی کا نقشہ مرتب کیے بغیر ہم مستقبل کے چیلنجوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

سوم : قوم میں اتفاق و اتحاد اور یک رنگی پیدا کرنا۔ سیاسی قیادت، عسکری قیادت، اہل علم و دانش اور ہمارے سائنس دان اور ایجاد کار سب کو چاہیے کہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور شوریٰ اور افہام و تفہیم کے ذریعے قومی سلامتی اور دفاعی استحکام کے لیے تفصیلی سوچ بچار اور فوری اور لمبے عرصے کی منصوبہ بندی کرنا ہو گی۔ اس سے وہ مستقل بنیادیں مضبوط ہوں گی جن پر معیشت اور دفاع دونوں کا انحصار ہے۔

چہارم : نیوکلیر دفاع اور روایتی دفاع کی حکمت عملیوں کا انضمام۔ دونوں کے درمیان ایسا توازن ہونا چاہیے جس سے ایک مربوط پالیسی وجود میں آسکے۔ اب تک یہ دونوں بڑی حد تک دو متوازی خطوط کی طرح کارفرما ہیں۔ ان کو مربوط کرنا اور اس مربوط پالیسی کی روشنی میں قیادت کی اعلیٰ سطح سے زیریں سطح تک عسکری نظام کی تشکیل نو ضروری ہے۔

پنجم : قومی وسائل کو امانت سمجھ کر استعمال کرنا اور ترقی دینا۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ زندگی کے سب ہی شعبوں میں قومی دولت کو اس طرح ضائع کیا گیا ہے کہ دل خون کے آنسو روتا ہے۔ کمی وسائل کی نہیں ہے بلکہ دیانت، امانت، حکمت اور جذبہ خدمت میں اور اللہ کے اور عوام کے سامنے جواب دہی کی فکر اور عملی انتظام میں ہے۔ ان کی فکر کیجیے اور پھر دیکھیے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ موجودہ وسائل میں برکت دیتا ہے اور نئے نئے وسائل سے سرفراز فرماتا ہے۔ اس کا وعدہ ہے کہ اگر ہم ایمان اور احتساب کے ساتھ اس کے راستے پر آگے بڑھیں گے تو زمین اپنے خزانے اگل دے گی اور آسمان سے نعمتوں کی بارش ہو گی۔ مالک کا یہ کرم ماضی میں بھی بار بار ہو چکا ہے اور آج بھی ہو سکتا ہے۔ ہم اس کے کرم کے صحیح معنی میں طالب تو بنیں!

صبر کرنے والے

سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور اچھے اور برے تمام حالات میں بندگی کے رویے پر ثابت قدم رہے۔ جس کا حال یہ نہ ہو کہ اچھا وقت آئے تو اپنی ہستی کو بھول کر خدا سے باغی اور بندوں کے حق میں ظالم بن جائے اور برا وقت آ جائے تو دل چھوڑ بیٹھے اور ہر ذلیل سے ذلیل حرکت کرنے پر اتر آئے۔

شکر کرنے والے

سے مراد وہ شخص ہے جسے تقدیر الٰہی خواہ کتنا ہی اونچا اٹھا لے جائے' وہ اسے اپنا کمال نہیں بلکہ اللہ کا احسان ہی سمجھتا رہے' اور وہ خواہ کتنا ہی نیچے گرا دیا جائے' اس کی نگاہ اپنی محرومیوں کے بجائے ان نعمتوں پر ہی مرکوز رہے جو برے سے برے حالات میں بھی آدمی کو حاصل رہتی ہیں' اور خوشحالی و بدحالی دونوں حالتوں میں اس کی زبان اور اس کے دل سے اپنے رب کا شکر ہی ادا ہوتا رہے۔

(تفہیم القرآن ' جلد ۴' ص ۵۰۶)

(بندہ خدا)

امید کی شعاعیں

جو افراد سنجیدگی کے ساتھ یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان میں ایک مثالی اسلامی معاشرہ وجود میں آئے' انھیں جو بات سب سے پہلے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے' وہ یہ ہے کہ ہماری قوم میں اس کے لیے خواہش کی کوئی کمی نہیں۔ اصل کمی آمادگی کی ہے اور اس سے بھی زیادہ کمی استعداد کی۔ بیشتر لوگ ان کم سے کم بنیادی اوصاف سے بھی خالی ہیں جن کا ہونا اس کام کے لیے ناگزیر ہے۔ دوسری بات جس پر نگاہ رکھنی چاہیے یہ ہے کہ ہماری قوم کے اندر جتنے باثر عناصر پائے جاتے ہیں' وہ زیادہ تر بگاڑ کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اور جو بگاڑنے میں لگے ہوئے نہیں ہیں' وہ سنوارنے کی فکر سے فارغ ہیں۔ اصلاح و تعمیر کے لیے کوشش کرنے والوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ تیسری بات جس سے غافل نہ رہنا چاہیے' یہ ہے کہ موجودہ دور میں اجتماعی زندگی کو بنانے اور بگاڑنے والی سب سے بڑی طاقت حکومت ہے اور جس جگہ جمہوری نظام رائج ہو' وہاں حکومت کے صحیح یا غلط ہونے کا سارا انحصار اس امر پر ہے کہ عوام الناس صحیح آدمیوں کے ہاتھ میں اقتدار سونپتے ہیں یا غلط آدمیوں کے ہاتھ میں۔ بگاڑ کے لیے کام کرنے والے تمام لوگ کسی دوسرے کام پر اتنی طاقت صرف نہیں کرتے' جتنی اس سلسلے میں عوام کو بہکانے پر صرف کرتے ہیں تاکہ وہ کبھی صحیح انتخاب کرنے کے قابل نہ ہو سکیں۔

یہ تین حقیقتیں مل جل کر ایسا بھیانک منظر پیش کرتی ہیں کہ ایک دفعہ تو اسے دیکھ کر آدمی کا دل بیٹھ جاتا ہے' اور وہ مایوسی کے ہجوم میں سوچنے لگتا ہے: یہاں کچھ بنائے بَن بھی سکے گا یا نہیں؟ لیکن ان کے مقابلے میں چند حقیقتیں اور بھی ہیں جنھیں نگاہ میں رکھنے سے یاس کے بادل چھٹنے لگتے ہیں اور امید کی شعاعیں چمکنی شروع ہو جاتی ہیں۔ پہلی حقیقت یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ صرف فاسد عناصر ہی سے بھرا ہوا نہیں ہے بلکہ اس میں کچھ صالح عناصر بھی موجود ہیں' ان کے اندر اصلاح و تعمیر کی صرف خواہش ہی نہیں بلکہ آمادگی و استعداد بھی پائی جاتی ہے۔ اور اگر اس میں کچھ کمی ہے تو وہ تھوڑی سی توجہ اور سعی سے دور کی جا سکتی ہے۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ ہماری قوم بحیثیت مجموعی شرپسند نہیں ہے۔ بے علمی و نادانی کی وجہ سے وہ دھوکہ کھا سکتی ہے اور کھاتی رہی ہے' لیکن وہ اس بگاڑ پر راضی نہیں ہے جو دھوکہ دینے والوں کے ہاتھوں رونما ہوتا ہے۔ اگر حکمت کے ساتھ منظم اور پیہم سعی کی جائے تو یہاں کی رائے عام کو اصلاح پسند طاقتوں کا مؤید بنانے میں بالآخر کامیابی ہو کر رہے گی۔ مایوسی صرف اس صورت میں ہو سکتی تھی کہ قوم کا سوادِ اعظم خود ان برائیوں کا طالب ہوتا جو معاشرے میں مفسد طاقتوں کے غلبے سے برپا ہو رہی ہیں۔

تیسری حقیقت یہ ہے کہ بگاڑ کے لیے کام کرنے والوں کو سب کچھ میسر ہے' مگر دو چیزیں میسر نہیں ہیں: ایک سیرت و کردار کی طاقت' دوسری اتحاد و اتفاق۔

آخری اور سب سے اہم حقیقت یہ ہے کہ اقامت دین کا کام اللہ تعالیٰ کا اپنا کام ہے اور اس کے لیے جو لوگ بھی کوشش کریں ان کو اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ وہ اخلاص اور صبر کے ساتھ کام کریں اور حکمت سے غافل نہ ہوں۔ ایسے لوگوں کی تعداد خواہ کتنی ہی کم ہو اور ان کے وسائل چاہے کتنے ہی قلیل ہوں' آخرکار اللہ کی تائید ہر کسر پوری کر دیتی ہے۔

مایوس کن ظاہر کے پیچھے امید کا یہ سروسامان ہے جو ڈھارس بندھاتا ہے کہ پاکستان میں ایک مثالی اسلامی معاشرے کا وجود محض ممکن ہی نہیں بلکہ اس کا فائز المرام ہونا بھی متوقع ہے۔ البتہ ضرورت جس چیز کی ہے وہ یہ ہے کہ جو افراد بھی اس کام کی حقیقی خواہش رکھنے والے موجود ہیں' وہ آرزوؤں اور تمناؤں کی منزل سے نکل کر کچھ کرنے کے لیے آگے بڑھیں' اور ان طریقوں سے کام کریں' جو سنت اللہ کے مطابق کامیابی کے لیے مقرر ہیں--- سنت اللہ یہ نہیں ہے کہ آپ بس خرابیوں پر تنقید کرتے رہیں اور وہ محض آپ کی باتوں سے دور ہو جائیں۔ جنگل کا ایک کانٹا اور راستے کا ایک روڑا بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا' جب تک آپ ہاتھ پاؤں نہ ہلائیں۔ پھر بھلا معاشرے میں مدتوں کی رچی بسی خرابیاں محض زبان کے پھاگ اڑانے سے کیسے رفع ہو جائیں گی۔

گیہوں کا ایک دانہ بھی کسان کی عرق ریزی کے بغیر پیدا نہیں ہوتا' پھر کیسے امید کی جا سکتی ہے کہ معاشرے میں خیرات و حسنات کی کھیتی بس دعاؤں اور تمناؤں سے لہلہانے لگے گی۔ تنقیدیں کارگر ہوتی ہیں مگر اس وقت جبکہ عالم اسباب میں ہم اپنے کرنے کا کام پورا کر دیں اور پھر اس کے بار آور ہونے کے لیے اللہ سے دعائیں مانگیں۔ فرشتے بلاشبہ اترتے ہیں مگر خود سے لڑنے کے لیے نہیں' بلکہ اہل حق کی مدد کے لیے اترتے ہیں جو خدا کی راہ میں جانیں لڑا رہے ہوں۔ پس جو لوگ بھی عمل کے لیے کوئی آمادگی اپنے اندر رکھتے ہوں' انھیں غلط توقعات اور بے جا امیدوں کو چھوڑ کر ٹھنڈے دل سے اس کام کے تقاضوں کو سمجھنا چاہیے اور خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہیے کہ انھیں یہ کام کرنا ہے' یا صرف بگاڑ پر نوحہ خوانی کرنے اور بناؤ کی آرزوئیں دل میں پالنے پر قناعت کرنی ہے۔ عمل کا فیصلہ جسے بھی کرنا ہو' جوش میں آ کر نہیں بلکہ ٹھنڈے دل سے سوچ کر کرنا چاہیے۔۔ وقتی جوش میں یہ طاقت تو ضرور ہے کہ آدمی اٹھے اور سینے پر گولی کھا کر جان دے دے لیکن اس میں یہ طاقت نہیں ہے کہ آدمی کو چار دن بھی کسی ایک برائی سے اجتناب یا ایک بھلائی کے التزام پر قائم رکھ سکے' کجا کہ اس کے بل بوتے پر کوئی شخص عمر بھر ایک مقصد کے پیچھے لگاتار محنت کرتا چلا جائے۔ تعمیری کام صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کا سوچا سمجھا فیصلہ یہ ہو کہ انھیں اپنی عمر عزیز اسی کام میں کھپانی ہے۔ (تحریک اسلامی: کامیابی کی شرائط)

قرآن میں دعوت و تبلیغ

تقاضے اور طریقۂ کار

ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی

پوری دنیاے انسانیت کے لیے اسلام خداے ذوالجلال کی عطا فرمودہ وہ نعمت غیر مترقبہ ہے جس کی امانت کا بار شیدایان اسلام کے کاندھوں پر رکھا گیا ہے۔ چونکہ کلمہ حق کے انقلابی بولوں کا دل و زبان سے اقرار و اعتراف کرنے والے' خیر امت' امت وسط اور شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ کے الٰہی القاب کے مستحق اسی وقت ہوتے ہیں جبکہ وہ امربالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیں' اس لیے عظیم ترین معروف "اسلام" کی نشرواشاعت اور عالم انسانیت تک اس امانت کی تبلیغ امت مسلمہ کے ہر ہر فرد کے لیے فرض منصبی قرارپاتی ہے۔ علم برداران اسلام کو اللہ کی کتاب پوری انسانی براوری میں اولیت و افضیلت کا مقام دیتی ہے اور ان کی ذمہ داریوں کو امربالمعروف اور نہی عن المنکر کے انتہائی جامع الفاظ میں واضح کرتی ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ (آل عمران ۳:۱۱۰) "اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو' بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو"۔

امربالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری مخصوص لباس زیب تن کرنے والے سفید ریشوں' اساتذہ اور علما و فضلا پر ہی نہیں ہے بلکہ ان تمام بندگان خدا پر ہے جو کلمہ طیبہ کے سچے اقرار کے بعد علم برداران اسلام کی صفوں میں آ ملتے ہیں۔ ہاں چونکہ اللہ تعالیٰ حکیم مطلق اور رحمٰن و رحیم ہے' اس لیے اس کی حکمت و رحمت کا تقاضا یہ تھا کہ اپنے کسی بندے پر اس کی طاقت سے زیادہ بار نہ ڈالے۔ چنانچہ جو جس حیثیت کا مالک ہے اور جس کے اندر جتنی اہلیت و استعداد ہے اسی کے مطابق اس سے فریضہ حق کی ادائیگی کا مطالبہ ہوتا ہے: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (البقرہ ۲:۲۸۶) "اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے' اس کا پھل

اسی کے لیے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے، اس کا وبال اسی پر ہے"۔

اسلام اللہ تبارک و تعالیٰ کی عظیم ترین امانت ہے۔ یہ امانت اسلام کے مکمل نظام زندگی کی شکل میں تمام خطہ ہائے عالم کے برادران اسلام تک پہنچائی جائے گی، اس لیے کہ کلمہ حق کے علم برداروں میں ایک بڑی اکثریت فکری اور عملی گمراہیوں میں ملوث ہونے والوں کی ہے۔ چنانچہ رفاہی اور اصلاحی کوششیں یہاں بھی ناگزیر ہو جاتی ہیں لہٰذا اسوۂ رسولؐ، سیرت صحابہؓ اور دوسرے صلحائے دین کی سیرتوں کی روشنی میں ان کی تربیت ہونی چاہیے تاکہ ذہنی، فکری اور عملی لحاظ سے وہ کماحقہ اپنے مذہب کی نمائندگی کر سکیں۔ لیکن ان کے بالمقابل وہ بندگان خدا جو اسلام سے وابستہ نہیں ہیں یا جو دین کی قدر و قیمت سے آشنا نہیں ہیں، دعوت و تبلیغ کے اصل محور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اللہ کی امانت کا دائرہ امت کی اصلاح کے پہلو سے دفاعی کوششوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ کار پوری انسانی برادری پر محیط ہے۔ چنانچہ کفر و شرک میں گرفتار بندگان خدا کو جب تک دعوت نہیں پیش کی جاتی، اس وقت تک دعوت حق کے فریضے کی ادائیگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ تب ہی وہ امانت ادا ہو گی جس کے بارے میں روز محشر ہم سے پوچھا جائے گا۔ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا (النساء ۴:۵۸)، "مسلمانو، اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو"۔

مرد مومن یہ سمجھتا ہے کہ معبودِ حقیقی کا انکار یا اس کی ذات و صفات میں معبودان باطل کی شرکت عظیم ظلم ہے (لقمان ۳۱:۱۳)، اور یہی وہ مذموم عمل ہے جس کے سرزد ہونے کے بعد انسان اشرف المخلوقات کی بلندیوں سے ارذل المخلوقات کی پستیوں میں جا گرتا ہے۔ بندۂ مومن کے دل و دماغ پر یہ بات چھائی ہوئی ہوتی ہے کہ غیراللہ کو خدا کی خدائی کا شریک بنانا، ضروریات و حوادث میں توقعات وابستہ کرنا اور انسانوں کو معبودانِ باطل کی پرستش کی دعوت دینا، عظیم ترین گمراہی ہے۔ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَہٗٓ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ (الاحقاف ۴۶:۵)، "آخر اس شخص سے زیادہ بھٹکا ہوا انسان اور کون ہو گا جو اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہیں دے سکتے"۔ اس کے برعکس داعی حق، ضلالت و گمراہی سے نکال کر انسانیت کو ہدایت کی شاہراہ دکھاتا ہے، تمام باطل خداؤں کا قلادہ اتار پھینک کر معبود حقیقی کے آستانے پر جھکنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس ضمن میں گھر، ماحول اور معاشرے کے اعتراضات و اختلافات، دھمکیوں اور سازشوں کا نشانہ بھی بنتا ہے اور ان تمام حالات و کوائف کا مقابلہ کرتے ہوئے فریضہ حق کی ادائیگی کو اپنا شیوۂ حیات قرار دے لیتا ہے اور یہ اس لیے کہ معبود حقیقی کی طرف سے دی گئی بشارت اس کے ذہن و دماغ میں ہر وقت مستحضر رہتی ہے۔ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (حم السجدہ ۴۱:۳۳)، "اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہو گی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں"۔

داعی حق کی عظمت پر وہ فرمودات الٰہی بھی ناطق شہادت ہیں جن میں کفر پر ثبات و اصرار اور صراط مستقیم سے روکنے کو وطیرۂ حیات بنانے والوں کے لیے مغفرت الٰہی جیسی عظیم نعمت سے محرومی کا اعلان فرما دیا گیا (محمد ۴۷:۳۴) اور اس کے برعکس ایمان و یقین کی دولت سے مالا مال اور خیر و سلامتی کی طرف دعوت دینے والوں کے عمل کو مسعود و مبارک قرار دیا گیا۔ دشوار گزار مراحل میں حوصلہ افزائی، دونوں جہاں کی سربلندی، معیت الٰہی اور روز جزا میں اعمال کی قدر افزائی جیسی نعمتوں کی یقین دہانی کرائی گئی۔ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ (حم السجدہ ۴۱:۳۱)، "ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمھارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی۔ وہاں جو کچھ تم چاہو گے تمھیں ملے گا اور ہر چیز جس کی تم تمنا کرو گے وہ تمھاری ہو گی"۔

دعوت کا کام انتہائی اعلیٰ و ارفع کام ہے کیونکہ اس کام کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین دولت، اسلام کو بطور امانت بندگان خدا تک پہنچایا جاتا ہے۔ اس عظیم ترین خدائی نوازش کو جبر و اِکراہ کے ساتھ کسی کے سر تھوپنا، دعوت حق اور داعی دونوں کی تذلیل و تحقیر ہے۔ داعی اور دعوت کے مقام کا صحیح اندازہ ان فرمودات الٰہی سے بھی کیا جا سکتا ہے جن میں ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے طمانیت و تسکین کا پیغام دیا گیا ہے۔ مکہ کے پر آشوب اور پر فتن حالات میں نبی کریمؐ یکہ و تنہا کھڑے ہوتے ہیں اور ایک خدا کی خدائی کا علم لے کر اعبدواللّٰہ کی دعوت دیتے ہیں۔ داعی اعظمؐ کے سلسلے میں مشرکین کا گھناؤنا کردار، کفر و شرک پر اصرار اور دعوت کو زک پہنچانے کی تمام تر سازشیں بھی واضح ہیں۔ اس کے باوجود آپ صلعم کو خدا کے گمراہ بندوں سے متعلق ہلاکت کی حد تک فکر و تشویش لاحق رہتی ہے۔ لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (الشعراء ۲۶:۳)، "اے نبیؐ! شاید تم اس غم میں اپنی جان کھو دو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے" اور ایک جگہ انتہائی شفقت و محبت کے انداز میں آپؐ کی حیثیت سے آپؐ کو باخبر کیا جاتا ہے، اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ (القصص ۲۸:۵۶)، "اے نبیؐ! تم جسے چاہو اسے ہدایت نہیں دے سکتے، مگر اللہ جسے چاہتا ہے، ہدایت دیتا ہے"۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ آپؐ کی داعیانہ حیثیت اور اصل ذمہ داری سے متعلق فرماتے ہیں، فَذَکِّرْ ۔ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَکِّرٌ ۔ لَسْتَ عَلَیْھِمْ بِمُصَیْطِرٍ (الغاشیہ ۸۸:۲۱-۲۲)، اچھا تو (اے نبیؐ) نصیحت کیے جاؤ، تم بس نصیحت ہی کرنے والے ہو، کچھ ان پر جبر کرنے والے نہیں ہو"۔[۱]

داعی کی ذمہ داری تبلیغ و تذکیر ہے۔ اگر داعی سمجھتا ہے کہ اس نے کماحقہ دعوت پیش کر دی ہے اور اس کے تمام نکات اپنی استعداد کے مطابق مدعو پر بے نقاب کر دیے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ اب مدعو کے اصرار اور حق سے انحراف کا معاملہ داعی سے متعلق نہیں رہا، اس کا خمیازہ اسے خود بھگتنا پڑے گا اور داعی کے اجر و ثواب میں ذرہ برابر بھی تخفیف نہ ہو گی۔ بلاشبہ مخلص اور

اللہ کے بندوں سے محبت رکھنے والے داعی کی یہ آرزو بھی ہوتی ہے کہ وہ شاہراہ ہدایت پر چل پڑے لیکن ہدایت اور گمراہی کے معاملات پر اللہ کی حکمرانی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے یہ بالکل ممکن تھا کہ وہ تمام بندگان خدا کو ہدایت یاب کر دیتا لیکن لِيَبْلُوَكُمْ کا مقصد فوت ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ملاحظہ فرمایئے' وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكُوا ۔ وَمَا جَعَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۔ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ (الانعام ۶:۱۰۷)' "اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو (وہ خود ایسا بندوبست کر سکتا تھا کہ) یہ لوگ شرک نہ کرتے۔ تم کو ہم نے ان پر پاسبان مقرر نہیں کیا ہے اور نہ تم ان پر حوالہ دار ہو"۔

چونکہ نبی کریمؐ کی بعثت مبارکہ کا مقصد ہی یہ ہے کہ دین حق کو دنیا کے تمام ادیان و مذاہب پر غلبہ و برتری حاصل ہو جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا فرمان ہے۔ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (الصف ۶۱:۹)' "وہی تو ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔ رحمت عالمؐ کے آقائے حقیقی سے جا ملنے کے بعد بعثت عام کے اس مقصد کی تکمیل کے لیے آپؐ کی امت کے ہر ہر فرد کا فرض منصبی ہے کہ وہ بنی نوع انسان کو اللہ کے دین کی امانت پہنچائے اور دین الٰہی کو زندگی کے ہر گوشے میں اور دنیا کے ہر خطے میں اپنی استعداد کے مطابق جاری و ساری کرنے کی جدوجہد کرے۔ خواہ اس مقدس مشن کی راہ میں اسے اپنی جان عزیز کا نذرانہ ہی کیوں نہ پیش کرنا پڑے۔ اعلائے کلمۃ الحق کی مبارک کوشش ہی امت مسلمہ کی شان امتیاز ہے' جس کی بدولت وہ اللہ تعالیٰ کی عنایات کی مستحق قرار پاتی ہے۔ دعوت دین کی ضرورت' افادیت اور اس کی عظمت سے متعلق مولانا امین احسن اصلاحی کی وضاحت میں وزن ہے:

"یہی فریضہ رسالت ہے جس کی وجہ سے اس امت کو "خیر امت" کہا گیا۔ اگر مسلمان اس فرض منصبی کو بھلا دیں تو یہ دنیا کی قوموں میں سے بس ایک قوم ہیں' نہ ان کے اندر کوئی خاص خوبی ہے' نہ کوئی خاص وجہ فضیلت اور نہ پھر اللہ تعالیٰ کو اس بات کی پرواہ ہے کہ وہ دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں یا ذلت کے ساتھ' بلکہ اس فرض کو فراموش کر دینے کے بعد وہ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ایک معتوب قوم بن جائیں گے جس طرح دنیا کی دوسری قومیں خدا کی طرف سے کسی منصب پر سرفراز کی گئیں تھیں' اپنا فرض انجام نہ دینے کی وجہ سے معتوب ہو گئیں" (دعوت دین اور اس کا طریقہ کار' ص ۴۱' ۴۲)

دعوت کا کام کوئی پیشہ ورانہ کام نہیں ہے کہ داعی' شخصی' نسلی اور گروہی مفادات کے پیش نظر حق و ناحق' جائز و ناجائز اور حلال و حرام میں سمجھوتہ یا مصالحت کی پالیسی اختیار کرے یا کسی دنیوی حرص و طمع کے دام میں پھنس کر دعوت و تبلیغ کی راہ میں سرگرم عمل ہو۔ خودستائی کا جذبہ' حصول شہرت کا شوق' دوسروں

کو بنظر استحقار دیکھنا' اپنے آپ کو اعلیٰ و ارفع تصور کرنا اور جاہ و منصب کی تلاش و جستجو' یہ سب وہ مظاہر ہیں' جن سے دعوت مجروح ہوتی ہے اور کاروبار کا رنگ روپ دھار لیتی ہے۔

دعوت و تبلیغ کی راہ میں سب سے قیمتی اثاثہ اخلاص و للّٰہیت ہے۔ دائرہ اسلام میں شمولیت کے وقت ایک بندۂ خدا کی زبان سے نکلے ہوئے لا الٰہ الا اللہ کے مقدس بول سے ہی اخلاص و للّٰہیت کی بنیاد رکھ دی جاتی ہے۔ اللہ واحد کو ہی معبود حقیقی تسلیم کرتے ہوئے ایک مخلص دل و زبان سے اعلان کرتا ہے کہ اس کا سر کسی غیراللہ کے آگے نہیں جھکے گا' وہ غیراللہ خواہ ذاتی غرض کی شکل میں ہو یا قومی مفاد کی شکل میں یا پھر دنیوی جاہ و منصب کی لالچ کی شکل میں۔ اس کا دل وحدت الٰہی کا نشیمن بن جاتا ہے اور وہ اپنی چال ڈھال اور کردار و عمل سے صرف اللہ واحد کے پرستار ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ اخلاص کا یہ سرمایہ داعی کو تمام قسم کے ذاتی اور گروہی مفادات کو بنظر حقارت دیکھنے پر ہی نہیں بلکہ نفس کی ذلت و محرومی اور حقوق کی پامالی برداشت کرنے کا حوصلہ افزا پیغام بھی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کی کتاب داعی حق سے جگہ جگہ مطالبہ کرتی ہے کہ اخلاص و للّٰہیت کے زیور سے آراستہ ہو کر اطاعت الٰہی میں سرگرم عمل رہو۔

عبادات میں اخلاص و للّٰہیت کے اس عظیم وصف سے آراستگی کا مطالبہ اقوام دیرینہ سے بھی تھا اور مشرکین عرب سے بھی۔ ہادی اعظمؐ اور ان کے رفقا کی زندگیاں اسی وصف سے مزین تھیں۔ اللہ عزوجل کی کتاب اس جہت سے آج بھی پوری انسانیت کے لیے مشعل راہ ہے۔ عبادت و اطاعت کا علم اٹھانے والوں سے آج بھی مطالبہ ہوتا ہے: وَمَآ اُمِرُوٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ (البینتہ ۹۸:۵)' "اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں' اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے' بالکل یک سو ہو کر"۔ چنانچہ قربانی جیسا مقدس عمل بھی جو خلیلؑ اللہ کی یاد میں انجام دیا جاتا ہے' بے قیمت ہو کر اللہ کے دربار میں شرف قبولیت سے محروم رہتا ہے' جب تک دولت و ثروت کے اشتہار' اعزہ و اقارب اور معاشرے میں شہرت اور دوسرے حقیر مقاصد سے پرے ہو کر صرف اور صرف مالک حقیقی کی خوشنودی کو مطمح نظر نہ مانا جائے۔ اللہ رب العزت کی کتاب میں اس صداقت کا اعلان ہے: لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (الحج ۲۲:۳۷)' "نہ ان کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں نہ خون' مگر اسے تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے"۔

اخلاص و للّٰہیت کے بعد فریضہ حق کی انجام دہی کے لیے جو اہم ترین اور ناگزیر ضرورت ہے' وہ ہے تعلق باللہ کی مضبوطی اور استحکام۔ دین حنیف کو تمام ادیانِ باطلہ اور افکار فاسدہ پر غلبہ و برتری دلانے کا مشن انتہائی اہم بھی ہے اور مشکل بھی۔ اس کی تکمیل کی خاطر داعی حق کو آقائے حقیقی کی طرف رجوع کرنا ہو گا' جو منبعِ تائید و نصرت اور سرچشمۂ رحمت و رافت ہے تاکہ کارزار حیات میں اس کی خطاؤں اور لغزشوں پر اللہ

تعالیٰ خط عفو پھیر دے اور دعوت کی مبارک جدوجہد کو لیلائے کامرانی کے آغوش سے ہمکنار کر دے۔

تعلق باللہ کی پہلی منزل یہ ہے کہ داعی کو اس بات پر پختہ یقین ہو کہ نافع اور ضار حقیقی معنوں میں صرف اللہ کی ذات ہے، کامیابی و ناکامی سب پر اسی کا اختیار ہے۔ اس استحضار کے ساتھ وہ اگر دعوت کی پرخار وادی میں قدم رکھتا ہے تو وہ یقین کامل کے سرمائے کی بدولت انتہائی ناخوشگوار احوال و کوائف میں بھی یاس و قنوطیت کا شکار نہیں ہوتا اور مفادات کے حصول میں تملق و چاپلوسی کو اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیتا۔ اس تعلق باللہ کی آخری اور اہم منزل یہ ہے کہ داعی ہر شعبہ زندگی میں اور اپنی تمام تر مصروفیات و مشغولیات میں ذکر الٰہی سے غافل نہیں ہوتا۔ اور وہ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (الانعام ۶:۱۶۲) کے الٰہی فرمان کا ترجمان بن جاتا ہے۔

تعلق باللہ کے لوازم میں نوافل کا اہتمام ایک لابدی امر ہے جس کے بغیر اللہ تعالیٰ سے قربت و تعلق کی بات کھوکھلی اور بے وزن ثابت ہوتی ہے۔ ان نوافل میں بھی تہجد کو منفرد مقام حاصل ہے۔ قرآن پاک میں متعدد مقام پر عباد الرحمٰن کی جو نمایاں خصوصیات وارد ہوئی ہیں ان میں ایک اہم خصوصیت یہی ہے کہ وہ راتوں کو نرم گرم بستر کو اللہ تعالیٰ کی خاطر چھوڑتے ہیں، اس سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کرتے ہیں، اپنی غلطیوں پر نادم و پشیماں ہوتے ہیں، کوتاہیوں کی معافی چاہتے ہیں اور دعوت حق کے اس کار عظیم میں اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کے حصول کے لیے گریہ و زاری میں مصروف رہتے ہیں۔ وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا ۔(الفرقان ۲۵:۶۴)، اللہ کے مخلص بندے وہ ہیں: "جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں"۔ ایسے ہی صالح اور مخلص بندوں کو ایک جگہ اللہ کی کتاب یوں سراہتی ہے۔ یَتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّیْلِ وَهُمْ یَسْجُدُوْنَ (آل عمران ۳:۱۱۳)، "راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں"۔ كَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ الَّیْلِ مَا یَهْجَعُوْنَ ۔ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ (الذاریات ۵۱: ۱۷-۱۸)، "راتوں کو کم ہی سوتے تھے، پھر وہی رات کے پچھلے پہروں میں معافی مانگتے تھے"۔

دعوت حق کی گراں بار ذمہ داری کی انجام دہی کے مرحلے میں ایک داعی کو قدیم و جدید جاہلیت کے تمام تلخ اثرات و نتائج سے سابقہ پڑتا ہے لیکن اسے چونکہ دعوت حق کی قندیل شب تاریک کی گھنگھور گھٹاؤں میں بھی روشن کرنا ہے اس لیے ضرورت ہے کہ داعی جس خدا کی دی ہوئی امانت کا بار اپنے ناتواں کاندھوں پر اٹھانے کے لیے آمادہ ہوا ہے، تمام نرم و گرم، شیریں و تلخ اور خشک و تر مسائل زندگی میں اسی مسبب الاسباب سرچشمہ قوت سے وابستہ ہو جائے جس نے اس کی فلاح و کامرانی کا نوشتہ تقدیر تیار کر رکھا ہے۔ دین اسلام کے نعمت بیش بہا اور اس کے عظیم امانت ہونے کا استحضار، خدا کی عطا فرمودہ دینی و دنیوی برکتوں کا احساس، عظیم ذمہ داری کا بوجھ اور اپنی کوتاہیوں پر ندامت و شرمندگی اگر داعی کی، آہ سحرگاہی کے موضوعات و

مشتملات بن جاتے ہیں تو اس کے یہ اشک ندامت بارگاہ ایزدی میں قیمتی موتی قرار پاتے ہیں۔

داعی جن امور و معاملات میں مدعو کو اپنا مخاطب بناتا ہے' وہ عموماً مدعو کے حالات' مزاج اور دلچسپیوں سے متضاد و متناقض ہوتے ہیں' اس لیے مخاطب معاشرے کی طرف سے اعتراضات و اختلاف بالکل متوقع ہوتے ہیں' ہاں اختلافات و اعتراضات کی نوعیتوں میں فرق ہو سکتا ہے لیکن مدعو اور معاشرے کے دوسرے مخاطبین کے سامنے داعی کی بے لوثی اگر واضح ہے تو اس کے امکانات بڑھ جاتے ہیں کہ داعی کی دعوت انھیں اپنا حلیف بنا لے۔ اخلاص کا جوہر اگر داعی کے قلب و ضمیر کی زینت بنا ہو تو اس کا زبان حال اور زبان قال دونوں ہی علی الاعلان گویا ہوتے ہیں: وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الشعراء ۲۶:۱۰۹)' "میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمے ہے" اور اخلاص کو مجروح کرنے والے کسی خیال' ترغیب' لالچ اور اکساہٹ پر اللہ رب العزت کی پناہ کا طلبگار ہوتا ہے: وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ (الاعراف ۷:۲۰۰)' "اگر کبھی شیطان تمھیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو"۔

داعیِ حق چونکہ کلمہ طیبہ کے انقلابی بولوں کی روح سے واقف ہوتا ہے' کسی معاملۂ زندگی میں بھی اللہ تعالیٰ کی امانت کا سودا نہیں کرتا اور باطل کے آگے کبھی بھی سپرانداز ہونے کو دعوت اور داعی دونوں کی تذلیل سمجھتا ہے۔ اس لیے خواہشات نفس کے بندوں' آبا و اجداد کے دین کا بھرم رکھنے والوں اور کرسی و اقتدار کے متوالوں کو داعی کی ادا پسند نہیں آتی اور مختلف زاویوں سے سرد و گرم جنگ چھیڑ دیتے ہیں۔ حق کی موجودگی میں باطل کا سامنے آنا' یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ آدم علیہ السلام کے مقابلے میں ابلیس لعین' حضرت ابراہیمؑ کے مقابلے میں نمرود' حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں فرعون اور مرشد اعظم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں ابولہب' ابوجہل اور عتبہ و ولید' یہ وہ تاریخی کردار ہیں جنھوں نے حق کے نام لیوا اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے چیدہ چیدہ بندوں کی راہ میں مصائب و مشکلات کے پہاڑ کھڑے کر دیے۔ لیکن اللہ کے یہ معزز بندے صبر و استقلال کے دیو بن کر منزل مقصود کے حصول میں دیوانہ وار بڑھتے رہے اور دعوت و تبلیغ کے مقدس مشن پر کوئی آنچ نہ آنے دی۔ بالآخر اللہ کی معیت انھیں نصیب ہوئی اور وہ دونوں جہاں میں فائز المرام ہوئے۔

دعوت کے ابتدائی مراحل میں جہاں گنے چنے چند نفوس قدسیہ داعی حق کا استقبال کرتے ہیں وہاں ایک کثیر تعداد نفس کے ان بندوں کی ہوتی ہے جن کے مفادات پر ضرب پڑتی ہے۔ پھر وہ کش مکش و مخاصمت میں صف آرا ہو کر منحوس ترین اقدامات کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ایسے حوصلہ شکن مراحل سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے کہ باوجودیکہ دعوت کماحقہ شرح و بسط کے ساتھ پیش کر دی جاتی ہے لیکن مخاطبین پر

اس کے مثبت اثرات و نتائج مشاہدے میں نہیں آتے بلکہ وہ دعوت سننے سے بھی گریزاں ہوتے ہیں۔ یہ مرحلہ داعی کے لیے بلاریب صبر آزما ہوتا ہے۔ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ۔ وَتَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (الاعراف ۷:۱۹۸) "اور اگر تم انھیں سیدھی راہ پر آنے کے لیے کہو تو وہ تمھاری بات سن بھی نہیں سکتے۔ بظاہر تم کو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ تمھاری طرف دیکھ رہے ہیں مگر فی الواقع وہ کچھ بھی نہیں دیکھتے"۔

داعیان حق کی راہ میں اس قسم کے شدائد و محن کا وقوع اللہ رب العزت کی سنت ہے اور اس میں کسی قسم کا تغیر ممکن نہیں۔ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا (فاطر ۳۵:۴۳) "تم اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے اور تم کبھی نہ دیکھو گے کہ اللہ کی سنت کو اس کے مقرر راستے سے کوئی طاقت پھیر سکتی ہے"۔ ایسی صبر آزما گھڑیوں میں صبر کا مطالبہ ہوتا ہے۔ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ (الاحقاف ۴۶:۳۵) "پس اے نبیؐ صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے، اور ان کے معاملے میں جلدی نہ کرو"۔ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ (الروم ۳۰:۶۰) "پس (اے نبیؐ) صبر کرو، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے، اور ہرگز ہلکا نہ پائیں تم کو وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے"۔

داعی سے ایک اور مطالبہ ہوتا ہے ہٹ دھرموں سے اعراض کا۔ مخاطبین و مدعوین میں بعض تو وہ صالح بندگانِ خدا ہوتے ہیں جو حقائق سے آگہی کے بعد دعوت اور داعی کو خوش آمدید کہتے ہیں اور ان کے اعمال و کردار صبغۃ اللہ میں رنگ جاتے ہیں۔ بعض ایسے ہوتے ہیں جو پس و پیش و تذبذب کے شکار ہوتے ہیں۔ ان کی طرف سے مثبت یا منفی کوئی فوری ردعمل نہیں ظاہر ہوتا۔ داعی کو یہاں اپنی صلاحیتوں کے مطابق موثر اور دلنشیں انداز میں دعوت پیش کرنی چاہیے یہاں تک کہ ان پر سے شک و ریب کی کیفیت ختم ہو جائے اور حقائق کے دریچے پوری طرح سے اس کے سامنے کھل جائیں۔ تیسرا گروہ ان افراد پر مشتمل ہوتا ہے جو دعوت حق کی عظمت کو جانتے ہیں اور صداقت ان کے سامنے عیاں ہوتی ہے لیکن آبا و اجداد کے شرف و عظمت کا خیال، ذاتی یا گروہی مفادات کی کشش اور نسلی اور قومی تعصبات کا حصار، ان کی قبولیت حق میں سدراہ بنتے ہیں۔ چونکہ ضد، عناد اور ہٹ دھرمی ان کا شعار بن جاتا ہے اس لیے داعی کے نصائح و مواعظ کا ان پر کوئی مثبت اثر نہیں پڑتا۔ مدعو کا قلب و ضمیر زمین شور ثابت ہوتا ہے جہاں موسلادھار بارش بھی بے سود ثابت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس زرخیز زمین میں بارش کے چند قطرے بھی زندگی کی لہر پیدا کر دیتے ہیں۔ دعوتِ حق بارانِ رحمت ہے۔ بلاشبہ اگر یہ بنجر قلب و ضمیر پر برسائی جائے تو اس عطا و بخشش کی تذلیل و تحقیر ہے۔ اس لیے قرآن حکیم نے ایسے لوگوں کو جو حقائق کو تسلیم کرنا نہیں چاہتے ہیں اور ضد و ہٹ دھرمی کی روش پر گامزن ہوں، جاہلین سے تعبیر کیا ہے اور یہ نسخہ تجویز کیا ہے کہ ایسے لوگوں سے سابقہ

پڑ جائے تو ان سے انتہائی شائستگی کے ساتھ اپنا پیچھا چھڑا لیا جائے اور اپنی صلاحیتیں وہاں صرف کی جائیں جہاں سے خوشگوار نتائج بر آمد ہونے کی توقع ہو۔ وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (الفرقان ۲۵:۶۳) "اور جب جاہلوں سے ان کا واسطہ پڑتا ہے تو سلام کہہ کر گزر جاتے ہیں"۔ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ (الاعراف ۷:۱۹۹) "اے نبیؐ، نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ، اور جاہلوں سے نہ الجھو"۔

قرآن پاک میں انبیا کی دعوتوں میں ایسے اعراض کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں۔ عیسیٰ ابن مریمؑ کے داعیانہ کردار کو پیش کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ کی قوم نے واضح نشانیوں کے باوجود عناد و ہٹ دھرمی کا طریقہ اختیار کیا تو انھوں نے اپنی دعوت کا مخاطب ان لوگوں کو بنایا جو انتہائی پسماندہ تھے اور ان سے انصار اللہ بننے کا مطالبہ کیا۔ ان کے دلوں پر دعوت حق نے فتح و تسخیر کی کمندیں ڈال دیں، توفیق الٰہی ان کے شامل حال ہوئی اور انھوں نے ایمان و ایقان کی نعمت سے سرفراز ہوتے ہوئے نحن انصار اللہ کی مقدس صدائیں بلند کیں۔ قرآن بالاختصار بنی اسرائیلیوں کے انحراف و انکار اور حواریوں کے قبول حق کی تصویر کشی کرتا ہے۔ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۔ وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۔ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ (المائدہ ۵:۱۱۰-۱۱۱) "پھر جب تو (حضرت عیسیٰؑ) بنی اسرائیل کے پاس صریح نشانیاں لے کر پہنچا اور جو لوگ ان میں سے منکر حق تھے انھوں نے کہا کہ یہ نشانیاں جادوگری کے سوا اور کچھ نہیں ہیں تو میں نے ہی تجھے ان سے بچایا، اور جب میں نے حواریوں کو اشارہ کیا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ تب انھوں نے کہا کہ "ہم ایمان لائے اور گواہ رہو کہ ہم مسلم ہیں"۔ دعوتی زندگی کی یہ سرگزشت بعض دوسرے مقامات پر بھی بیان کی گئی ہے اور داعیان حق کو اس سرگزشت کی روشنی میں یہ پیغام دیا گیا ہے کہ قوم کے معزز لوگ اگر دعوت حق سے انحراف و سرکشی کا رویہ اختیار کرتے ہیں تو بظاہر یہ حوصلہ شکن اقدام ہوتا ہے لیکن فی الحقیقت اعراض و انکار اور ضد و ہٹ دھرمی کے منحوس نتائج مدعو سے متعلق ہوتے ہیں، داعی کو قنوطیت و مایوسی کا لبادہ اتار پھینکتے ہوئے بڑے عزم و حوصلے کے ساتھ اس گروہ یا جماعت کے افراد کو اپنا مخاطب بنانا چاہیے جو حق و صداقت کے جویا ہیں، چاہے یہ طبقہ افراد سیاسی، معاشی اور سماجی لحاظ سے خستہ حالی کا ہی کیوں نہ شکار ہو۔ دعوت حق کے اس طریقہ کار اور اس کے مثبت اثرات و نتائج کو حضرت عیسیٰؑ سے متعلق کرتے ہو اللہ کی کتاب فرماتی ہے، يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۔ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ۔ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ (الصف ۶۱:۱۴) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کے مددگار بنو، جس طرح عیسیٰؑ ابن مریم نے حواریوں کو خطاب کرکے کہا تھا: "کون ہے اللہ کی طرف

(بلانے) میں میرا مددگار؟" اور حواریوں نے جواب دیا تھا: "ہم ہیں اللہ کے مددگار"۔ اس وقت بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لایا اور دوسرے گروہ نے انکار کیا۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلے میں تائید کی اور وہی غالب ہو کر رہے"۔

مکہ کے پر آشوب اور پُرفِتَن احوال و کوائف میں نبی اکرمؐ دعوت حق کا عَلَم بلند کرتے ہیں۔ آغاز دعوت میں جہاں کچھ سعید روحیں آپؐ کی دعوت کا استقبال کرتی ہیں وہاں بہت بڑی اکثریت دولت و ثروت، عزت و عظمت اور حکومت و اقتدار کے نشے میں بدمست ہو کر دعوت کی بیخ کنی کرنے اور داعی اعظمؐ کا کام تمام کر دینے کی ناپاک کوشش کرنے سے بھی گریز نہیں کرتی۔ لیکن آپؐ کے اس مقدس مشن کی سرگرمی میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں آتی بلکہ ان لوگوں کے شاہراہ ہدایت پر آنے کی فکر ان کو ہلاک کیے جاتی ہے۔ کسی بھی سماج کے صاحب مرتبت افراد اور کسی بھی قوم کے معززین کو نمایاں مقام حاصل ہوتا ہے۔ معاشرے کے ان روَسا کا معاشرے پر ایک رعب ہوتا ہے۔ معاشی لحاظ سے خوشحالی و فارغ البالی کے علاوہ سیاسی اور مذہبی امور و معاملات میں بھی عزت و برتری حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ دعوت دین کے فروغ و اشاعت سے متعلق مصالح کے پیش نظر آپؐ معززین قوم کو اپنی دعوت کا محور خاص سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وقت، محنت اور ذہانت کا قیمتی اثاثہ ان حضرات معززین بالخصوص زعمائے قریش کے شکوک و شبہات اور اختلافات و اعتراضات رفع کرنے میں صرف کرتے ہیں لیکن وہ اپنی ضد، ہٹ دھرمی اور انانیت کی بنا پر دعوت حق سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ اور آبا و اجداد کی روش کو ہی سرمایہ افتخار سمجھتے ہیں تو اللہ تبارک و تعالیٰ آپؐ سے ہمکلام ہوتے ہیں اور ان سے اعراض کی تلقین فرماتے ہیں، فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ (السجدہ ۳۲:۳۰)، "اچھا، انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور انتظار کرو، یہ بھی منتظر ہیں"۔

اللہ کی کتاب اس پر سند ہے کہ ایک موقع کو غنیمت جان کر آپؐ روَسائے قریش کو خطاب فرما رہے تھے۔ ابھی دوران نابینا صحابی حضرت ابن ام مکتومؓ کچھ معاملات و مسائل کی عقدہ کشائی کے لیے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے صحابی مذکور کی بجائے اس دوران مجمع قریش پر ہی توجہ رکھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو آپؐ کا یہ عمل پسند نہ آیا۔ چنانچہ پیار و محبت بھرے انداز میں نصیحت فرمائی کہ ضد اور ہٹ دھرمی کو اپنی زندگی کا وطیرہ بنانے والوں کے بالمقابل جویائے حق اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس پر توجہ کی جائے اور اس کے مسائل کی گتھیاں سلجھائی جائیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوبؐ کو متنبہ فرماتے ہیں: عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى۔ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى۔ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى (عبس ۸۰:۱-۳)، "ترش رو ہوا اور بے رخی برتی اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آگیا۔ تمھیں کیا خبر، شاید وہ سدھر جائے"۔ (جاری)

حُبِّ جاہ

امام غزالیؒ

جاہ انسان کو کیوں طبعی طور پر محبوب ہے' یہاں تک کہ شدید مجاہدہ کے بغیر کسی قلب کا بھی اس سے خالی ہونا مشکل ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ جس بنا پر سونا چاندی اور مال کی تمام اقسام محبوب ہوتی ہیں' بعینہ اسی بنا پر جاہ بھی محبوب ہوتا ہے۔ بلکہ جس طرح سونا' چاندی سے زیادہ محبوب ہے' خواہ وہ مقدار میں برابر ہی کیوں نہ ہوں' اسی طرح جاہ' مال سے زیادہ محبوب ہوتا ہے۔

یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ درہم و دینار کی ذات میں کوئی کشش اور معنویت نہیں' اس لیے کہ نہ وہ کھانے کے کام کے ہیں' نہ پینے کے' نہ شادی بیاہ کے' نہ پوشاک و لباس کے' اپنی ذات کے لحاظ سے تو وہ اور کاغذ کے ٹکڑے برابر ہی ہیں۔ لیکن ان دونوں میں کشش اور محبوبیت محض اس بنا پر ہے کہ وہ محبوب چیزوں کے حصول کا ذریعہ اور خواہشات کی تکمیل کا سامان ہیں۔ یہی معاملہ جاہ کا ہے۔ اس لیے کہ جاہ دلوں کی تسخیر کا نام ہے۔ جس طرح سے سونے چاندی کی ملکیت ایسی قدرت عطا کرتی ہے' جس سے انسان اپنے تمام اغراض و مقاصد تک پہنچ سکتا ہے' اسی طرح سے بندگانِ خدا کے قلوب کی تسخیر تمام اغراض و مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ اسی بنا پر سونا چاندی اور جاہ انسان کو محبوب ہے۔

لیکن محبوبیت میں شریک ہونے کے ساتھ جاہ کو مال پر کئی وجوہ سے ترجیح حاصل ہے' اور اس کی محبوبیت مال کی محبوبیت سے کہیں بڑھی ہوئی ہے۔ اس کے تین نمایاں اسباب ہیں:

پہلا سبب تو یہ ہے کہ جاہ کے ذریعے سے مال تک پہنچنا' مال کے ذریعے سے جاہ تک پہنچنے کے مقابلے میں آسان ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک عالم یا زاہد جس کا اعتقاد لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا ہے' اگر مال حاصل کرنا چاہے تو اس کے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔ اس لیے کہ لوگوں کے مال و دولت ان لوگوں کے دلوں کے تابع ہوتے ہیں۔ اب اگر ان کے دل کسی کے تابع ہو جائیں تو ان کے مال بھی اسی کے تابع ہو جائیں گے' اور وہ اپنی دولت بھی اسی کے قدموں پر نثار کر دیں گے۔ اس کے برخلاف ایک کم مرتبہ اور

ذلیل آدمی' جس میں کمال کی کوئی صفت نہیں ہے' اگر اس کو کوئی خزانہ بھی مل جائے اور اس کو وہ جاہ حاصل نہیں ہے' جس سے وہ اپنے مال کی حفاظت کر سکے' اگر اس مال کے ذریعے جاہ تک پہنچنا چاہے گا تو نہیں پہنچ سکے گا۔ اس لیے کہ جاہ مال کا آلہ اور وسیلہ ہے۔ جو جاہ کا مالک ہے' وہ بآسانی مال کا بھی مالک بن سکتا ہے۔' لیکن جو مال کا مالک ہے وہ ہر حالت میں جاہ کا مالک نہیں بن سکتا۔ اس لیے جاہ مال سے زیادہ محبوب ہوتا ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ مال کے لیے ہروقت خطرہ ہے کہ وہ کسی آزمائش میں آجائے' چوری یا غصب کے ذریعے تلف ہو جائے' بادشاہ اور ظالم بھی اس کی تاک میں لگے رہتے ہیں' یوں بھی اس کو محافظوں' پہرہ داروں اور محفوظ صندوقوں کی ضرورت ہے' پھر بھی اس کے لیے ہزار خطرے ہیں۔ لیکن دل جب کسی کے غلام بن جائیں' تو ان کے لیے کوئی آفت نہیں۔ خلق کے دلوں میں مقبولیت دراصل محفوظ خزانے ہیں جو چوروں' غارت گردوں اور غاصبین کی دسترس سے باہر ہیں۔ ملکیتوں میں سب سے محفوظ ملکیت زمین اور جایداد ہے' لیکن اس میں بھی غاصبانہ اور ظالمانہ کارروائیوں کا خطرہ ہے اور پہرہ اور حفاظت کی اس کو بھی ضرورت ہے۔ لیکن دلوں کے خزانے خود ہی محفوظ و مامون ہیں' اور جاہ کو کسی غصب و سرقہ کا خطرہ نہیں۔ ہاں' دلوں پر بھی تھوڑا بہت تصرف کیا جا سکتا ہے' اور جس سے عقیدت مندی ہے' اس کی طرف سے اعتقاد پھیرا جا سکتا ہے' اور بدگمانی پیدا کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کا ازالہ مشکل نہیں اور ایسا عمل ہر ایک کے لیے آسان نہیں۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ قلوب کی ملکیت میں ازدیاد و نمو و اضافہ ہوتا رہتا ہے' اور اس کے لیے کسی محنت و جفاکشی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ قلوب جب کسی شخص کے علم یا عمل کی وجہ سے اس کے حلقہ بگوش اور معتقد ہو جاتے ہیں' تو زبانیں اس کا کلمہ پڑھنے لگتی ہیں' لوگ دوسروں سے اس کا تذکرہ کرتے ہیں' اور نئے نئے دل اس کے مفتوح ہوتے جاتے ہیں۔ اسی بنا پر انسان طبعی طور پر شہرت اور ناموری کا دلدادہ ہے۔ اس لیے کہ جب اس کا چرچا دوسرے شہروں اور ملکوں میں ہوتا ہے' نئے نئے دل شکار ہوتے ہیں اور اس کے حلقہ بگوش بنتے ہیں' اسی طرح اس کی محبت و عظمت ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتی اور بڑھتی رہتی ہے' اور کہیں جا کر رکتی نہیں۔ برخلاف مال کے کہ جو جتنی مقدار کا مالک ہے' بس اس کا مالک ہے' اس میں بغیر سخت محنت اور جانفشانی کے اضافہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن جاہ خود بخود ترقی پذیر ہے' اور اس کی کوئی حد نہیں۔ مال میں ٹھہراؤ اور وقوف ہے' جاہ پھلتا پھولتا رہتا ہے۔ اسی لیے جب جاہ میں ترقی ہو جاتی ہے' اور شہرت عام حاصل ہو جاتی ہے اور لوگ کسی شخص کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے ہیں' تو مال و دولت اس کی نظر میں ہیچ ہو جاتا ہے۔

یہ تو مال کی جاہ پر ترجیح کے نمایاں اسباب ہیں۔ اگر تفصیل کی جائے تو اور بہت سے وجوہ نکلیں گے۔

اگر کوئی شخص کہے کہ اس تقریر کا نتیجہ تو یہ ہے کہ انسان کو مال و جاہ سے اسی قدر محبت ہونی چاہیے کہ ان کے ذریعے لذتیں حاصل کر لے اور کلفتیں دور کر دے۔ اس لیے کہ مال و جاہ محبوبات کا ذریعہ ہیں' اور محبوبات کے حصول کا ذریعہ بھی محبوب ہوتا ہے۔ لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ بات یہیں جا کر نہیں رکتی۔ انسان اموال کے جمع کرنے' خزانہ پر خزانہ اور ذخیرہ پر ذخیرہ کرنے میں مصروف رہتا ہے' یہاں تک کہ وہ ضروریات کی سرحد کو بھی پار کر جاتا ہے' یہاں تک کہ اس کا وہ حال ہو جاتا ہے (جو حدیث شریف میں بیان کیا گیا ہے) کہ اگر بندے کے پاس سونے کی دو گھاٹیاں ہوں تو وہ تیسری کا حریص ہو گا۔ اسی طرح سے انسان جاہ میں وسعت و ترقی کی فکر میں رہتا ہے' اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی شہرت لوگوں میں پھیلتی جائے' ان دور دراز ملکوں اور لوگوں تک بھی پہنچ جائے جن کے متعلق وہ قطعی طور پر جانتا ہے کہ وہ ان کے درمیان کبھی قدم بھی نہیں رکھے گا' اور کبھی ان سے ملاقات کی بھی امید نہیں کہ ان کی تعظیم سے اس کو خوشی حاصل ہو گی' یا وہ اپنی دولت اس پر خرچ کریں گے' یا اس کی غرض بر آری کریں گے۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی اس کو اس سے بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے' اور دل میں اس کا مزہ لیتا رہتا ہے' کہ اس کا ان ملکوں اور لوگوں میں چرچا ہو' اور اس کو ان کے ہاں جاہ حاصل ہو۔ بظاہر یہ ایک حماقت کی بات معلوم ہوتی ہے' اس لیے کہ یہ ایک ایسی چیز کی خواہش ہے جس کا دنیا و آخرت میں کوئی فائدہ نہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی جاہ کی ایسی محبت دلوں میں عام طور پر پائی جاتی ہے' جس کا ازالہ ممکن نہیں' اس کے دو سبب ہیں: ایک جلی' جس کا ادراک سب کر سکتے ہیں--- ایک خفی' جو بڑا سبب ہے' لیکن اتنا نازک ہے کہ غبی تو غبی ذکی بھی اس کو بمشکل محسوس کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کا تعلق نفس و طبیعت کی ایک ایسی خاصیت سے ہے جس کا علم باریک بین حضرات اور ان اشخاص کو ہے جو طبائع انسانی کی گہرائیوں میں غوطہ لگا سکتے ہیں۔

پہلا سبب تو یہ ہے کہ انسان فطرتاً محبوب کے بارے میں بدگمان واقع ہوا ہے' اور خطرات کو دور کرنا چاہتا ہے۔ ع عشق است و ہزار بدگمانی۔ انسان کی بسر اوقات کے لیے خواہ ضروری سامان موجود ہو' لیکن اس کی آرزوئیں بہت طویل ہوتی ہیں۔ اس کے دل میں بار بار یہ خطرہ گزرتا ہے کہ جو مال فی الحال اس کی ضروریات کے لیے کافی ہے شاید تلف ہو جائے' اس کو اور مال کی ضرورت ہو۔ جب اس کے دل میں اس کا خیال آتا ہے' تو اس کے دل میں فکر و غم کا جوش اٹھتا ہے۔ یہ خلش اس کی جبھی دور ہو سکتی ہے جب اس کو دوسرے مال کے مل جانے سے یہ اطمینان حاصل ہو جائے کہ اگر پہلا مال ضائع ہو گیا' یا اس پر کوئی آفت آئی' تو یہ دوسرا مال موجود ہے۔

اسی طرح وہ اپنی ذات سے دلچسپی اور زندگی کی محبت کی بنا پر اپنی زندگی کا بہت طویل اندازہ لگاتا ہے، اور نئی نئی ضرورتوں کے پیش آنے کا حق رکھتا ہے، اور نئے نئے خطروں اور نئی نئی آفتوں کو فرض کرتا رہتا ہے، اور ان کے تصور سے لرزہ براندام رہتا ہے۔ اس لیے ان خطروں کو زائل کرنے کے وسائل سوچتا رہتا ہے، اور اس کا سب سے بڑا وسیلہ اس کی نظر میں یہ ہے کہ مال اتنا کثیر ہو کہ اگر اس کے کسی حصے پر کوئی زد پڑے تو دوسرے حصے سے وہ اپنا کام نکال سکے۔

یہ خوف اور فکر مندی اس کو مال کی کسی مخصوص مقدار پر قانع نہیں ہونے دیتی، اور وہ کسی حد پر بھی جا کر نہیں ٹھہرتا، یہاں تک کہ ساری دنیا کو اپنی ملک بنا لینے کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ: "دو حریص ایسے ہیں، جو کبھی سیر نہیں ہوتے، علم کا حریص اور مال کا حریص"۔

بعینہٖ یہی علت دور، دراز کے شہروں اور بیگانہ لوگوں کے دلوں میں اعتقاد اور جاہ پیدا ہونے کی خواہش میں ہوتی ہے۔ حب جاہ کا مریض بھی ان خیالی خطرات کو سوچتا رہتا ہے جو پیش آ سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کو اپنے وطن کو خیرباد کہنا پڑے، ممکن ہے کہ دوسرے ملکوں کے لوگ اس کے شہر میں آ جائیں اور اس کو ان سے کام پڑ جائے، اور جب تک یہ سب کچھ ممکن ہے، اور یہ کوئی ناممکن الوقوع بات نہیں ہے کہ اس کو ان کی ضرورت پڑے، نفس کو اس بات کی فرحت و لذت ہوتی ہے کہ اس کا اعتقاد اور عظمت ان بعید الوطن لوگوں کے دل میں قائم ہے جن سے کبھی کام پڑ سکتا ہے۔

دوسرا سبب جو زیادہ طاقتور ہے، وہ یہ کہ روح ایک امر ربانی ہے۔ "حکم ربانی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ علوم غیب کے اسرار میں سے ہے۔ اس کے اظہار کی اجازت بھی نہیں۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حقیقت کا اظہار نہیں فرمایا۔ لیکن اس کی حقیقت کا علم حاصل کیے بغیر بھی تم کو اتنا معلوم ہو سکتا ہے"کہ قلب میں ایک تو بہیمی صفات یعنی کھانے پینے اور جماع کا میلان پایا جاتا ہے۔ ایک میلان درندوں کی صفت یعنی قتل و ضرب و ایذا کا، اور ایک شیطانی صفات یعنی مکر و فریب کا، اور اسی کے ساتھ ایک میلان صفات ربوبیت، یعنی کبر و عظمت، عزت تجبر اور سربلندی کا بھی پایا جاتا ہے۔ قلب انسان مختلف اصول و عناصر سے مرکب ہے، جن کی شرح و تفصیل میں بڑی طوالت ہے۔

قلب میں امر ربانی کا جو حصہ ہے اس کی بنا پر انسان کے اندر طبعی طور پر ربوبیت کی خواہش پائی جاتی ہے۔ ربوبیت کیا ہے؟ کمال میں یکتائی اور مستقل وجود جو کسی کا شرمندۂ احسان نہ ہو۔ اس لیے کمال صفات الوہیت میں سے ہے، اور وہ انسان کو بالطبع محبوب ہے۔ اور کمال یہی ہے کہ وجود میں یکتا ہو، اس لیے کہ وجود میں کسی اور کی شرکت یقیناً ایک نقص ہے۔ آفتاب کا کمال یہ ہے کہ وہی ایک آفتاب ہے۔ اگر کوئی

دوسرا آفتاب ہوتا' تو یہ اس آفتاب کے چہرۂ کمال کے لیے داغ ہوتا' اس لیے کہ وہ اپنی شان آفتابی میں یکتا نہ ہوتا۔ وجود کی یکتائی اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کو حاصل ہے' اس لیے کہ اس کے سامنے کوئی موجود (حقیقی) نہیں' اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے' وہ اس کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے' جو اپنے بل بوتے پر نہیں رہ سکتا' وہ اسی کے سہارے قائم ہے۔ تو درحقیقت اس کے سامنے کوئی موجود ہی نہیں۔ اس لیے کہ معیت کے لیے رتبہ کی مساوات ضروری ہے' اور رتبہ کی مساوات کمال کے لیے نقص ہے۔ کامل وہی ہے جس کا کوئی ہم مرتبہ نہ ہو۔ آفاق عالم میں آفتاب کے نور کی تابش آفتاب کا نقص نہیں بلکہ اس کا کمال ہے۔ آفتاب کے لیے نقص تو دوسرے ہم مرتبہ آفتاب کا وجود ہے۔ عالم میں بھی ہر چیز کا وجود انوار قدرت کی تابش کا فیضان ہے' یہ سب تابع ہیں' متبوع نہیں' پس ربوبیت کی شان وجود کی یکتائی ہے اور یہی کمال ہے۔

انسان بھی بالطبع اس بات کا خواہش مند ہے کہ وہ کمال میں یکتا ہو۔ بعض مشائخ نے فرمایا ہے کہ ہر انسان کے باطن میں وہی بات مضمر ہے جس کو فرعون نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ انا ربکم الاعلیٰ۔ لیکن اس کو اس کا موقع نہیں ملتا' عبودیت نفس اسی لیے نفس پر شاق اور ربوبیت اسی لیے طبعاً سہل اور مرغوب ہے۔ یہ اسی نسبت ربانی کی وجہ سے ہے جس کی طرف قل الروح من امر ربی میں اشارہ ہے۔

لیکن جب وہ انتہائے کمال تک پہنچنے سے عاجز رہتا ہے' تو اس کے کمال کی خواہش بالکلیہ زائل نہیں ہوتی۔ اب بھی وہ کمال کا خواہشمند اور متمنی ہوتا ہے' اور اس کو کمال سے بالذات لذت حاصل ہوتی ہے' کمال کے علاوہ کسی اور مقصود کی خاطر نہیں (جس کا کمال ذریعہ ہے)' بلکہ نفس کمال کی خاطر۔ دنیا میں جو بھی موجود ہو' اس کو اپنی ذات سے محبت اور اپنی ذات کے کمال سے محبت ہے--- اور ہر ایک کو ہلاکت اور فنا نامرغوب ہے' اس لیے کہ اس میں اپنی ذات اور اپنی صفات کمال کا فنا سمجھتا ہے۔

کمال تو یہی ہے کہ وجود میں یکتائی حاصل ہو اور تمام موجودات پر غلبہ اور حکمرانی۔ اس لیے کہ کامل ترین کمال یہ ہے کہ دوسرے کا وجود تمھارا ہی رہین منت ہو۔ اگر وہ تمھارا رہین منت نہیں ہے تو کم از کم اتنا ہو کہ تم اس پر غالب ہو۔ اس بنا پر سب پر غلبہ حاصل کرنا انسان کو طبعی طور پر محبوب ہے' اس لیے کہ یہ کمال کی ایک قسم ہے۔ ہر موجود جو اپنی ذات کا شناسا ہے وہ اپنی ذات کا عاشق ہے' اور اپنی ذات کے کمال کا بھی عاشق ہے' اور اس سے اس کو لذت حاصل ہوتی ہے۔

کسی چیز پر غلبے کے معنی یہ ہیں کہ تم اس پر اثر ڈال سکو' اپنے ارادے کے مطابق اس میں تغیر کر سکو' اور اپنی مرضی کے مطابق اس میں تصرف کرو۔ انسان نے چاہا تو یہ تھا کہ اس کو تمام موجودات پر غلبہ حاصل ہو جائے لیکن موجودات میں سے کچھ موجود ایسے ہیں جو کسی تغیر کو قبول نہیں کرتے' جیسے اللہ کی ذات و صفات۔ اور بعض موجود ایسے ہیں جو تغیر کو قبول کرتے ہیں' لیکن ان پر مخلوق کی کوئی دسترس نہیں اور اس پر

ان کا کوئی زور نہیں چلتا، جیسے افلاک و کواکب، ملکوت، سماوات، نفوس، ملائکہ، جن و شیاطین اور جیسے پہاڑ و سمندر اور ان کے بیچ کی چیزیں۔ تیسری قسم وہ ہے جس میں انسان اپنی قدرت سے تغیر کر سکتا ہے، جیسے زمین اور اس کے اجزا معدنیات، نباتات، حیوانات۔ اور انھی میں سے انسانوں کے دل بھی ہیں، جو بدن ہی کی طرح تاثر اور تغیر قبول کرتے ہیں۔

جس قسم پر انسان قدرت حاصل کر سکتا ہے، جیسے ارضیات وغیرہ، تو وہ طبعی طور پر ان پر غلبہ اور اتنی قدرت حاصل کرنا چاہتا ہے کہ ان میں اپنی منشا کے مطابق تصرف کر سکے۔ ان کی بھی دو قسمیں ہیں: اجسام اور ارواح۔

اجسام تو روپیہ، پیسہ اور سامان ہے۔ ان کے بارے میں تو انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کو ان میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار ہو، وہ ان کو اٹھا بٹھا سکے، جس کو چاہے دے، جس کو چاہے نہ دے۔ اس لیے کہ یہ قدرت ہے اور قدرت کمال ہے، اور کمال صفات ربوبیت میں سے ہے اور ربوبیت بالطبع محبوب۔ اسی لیے اس کو اموال کی محبت ہے، چاہے اس کو اپنے پہننے کھانے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے بھی اس کی ضرورت نہ ہو۔ اسی طرح سے غلام رکھنا اور آزاد شریف لوگوں کو اپنا غلام بنانا، خواہ زبردستی اور تغلب سے ہو، یہاں تک کہ ان کے اجسام اور ان کی ذات میں تصرف کر سکے، یعنی بیگار لے سکے، چاہے ان کے دل غلام نہ بنیں۔ اس لیے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان غلاموں کے دل میں اس کا اعتقاد نہیں ہوتا، اور ان کو اس سے محبت نہیں ہوتی، لیکن کبھی محض غلبہ بھی محبت کا قائم مقام بن جاتا ہے۔ انسان کو ایسا رعب و داب بھی لذیذ اور عزیز ہے، جو زبردستی کی بنا پر ہو، اس لیے کہ اس میں قدرت کا اظہار ہوتا ہے، اور انسان اس کا دیوانہ ہے۔

دوسرے، آدمیوں کے نفوس اور قلوب ہیں۔ یہ روئے زمین کی سب سے زیادہ بیش قیمت اور نفیس چیز ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ اس کو ان قلوب پر غلبہ و قدرت حاصل ہو جائے، تاکہ وہ اس کے لیے مسخر ہو جائیں، اور اس کے ایک اشارے پر کام کریں۔ اس لیے کہ اس میں غلبہ کا کمال پایا جاتا ہے اور صفات ربوبیت سے مشابہت ہے۔ قلوب صرف محبت سے مسخر ہوتے ہیں۔ محبت کمال کے اعتقاد سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ہر کمال محبوب ہے۔ اور کمال اس لیے محبوب ہے کہ وہ صفات الٰہیہ میں سے ہے، اور صفات الٰہیہ سب انسانوں کو بالطبع محبوب ہیں، اس لیے کہ انسان میں ایک نسبت ربانی پائی جاتی ہے، اور یہ نسبت غیر فانی ہے، نہ موت اس کو ختم کر سکتی ہے اور نہ مٹی اس پر قابو پا سکتی ہے۔ یہی نسبت ربانی ایمان و معرفت کا محل ہے، وہی لقائے الٰہی تک پہنچنے والی ہے اور وہی اس کے لیے کوشش کرنے والی ہے۔

جاہ کے معنی قلوب کا مسخر ہونا ہے۔ اور جس کے لیے قلوب مسخر ہو گئے، اس کو ان پر قدرت و استیلا

حاصل ہو گیا۔ اور قدرت و استیلا کمال ہے اور کمال اوصاف ربوبیت میں سے ہے۔

پس قلب کو جو چیز بالطبع محبوب ہے وہ کمال ہے' خواہ علم سے حاصل ہو' خواہ قدرت سے۔ مال و جاہ بھی اسباب قدرت میں سے ہیں' اس لیے کہ وہ محبوب کا وسیلہ ہیں' اور محبوب کا وسیلہ بھی محبوب ہوتا ہے۔ پھر نہ معلومات کی کوئی انتہا ہے' نہ مقدورات کی کوئی انتہا ہے۔ جب تک کہ ایک چیز بھی دنیا میں باقی ہے جو معلوم کی جا سکتی ہے' اور ایک چیز بھی دنیا میں موجود ہے جس پر قدرت حاصل کی جا سکتی ہے' تو نہ شوق کو سکون ہے اور نہ نقص کو زوال۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو حریص کبھی آسودہ نہیں ہو سکتے" (احیاء علوم الدین' ج ۳' ماخوذ از ابوالحسن علی ندوی' تاریخ دعوت و عزیمت' ج ۱' ص ۱۹۷-۲۰۱)

(انتخاب : خرم مرادؒ)

اخلاص

ابن مردویہ یزید الرقاشی سے نقل کرتے ہیں:

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا ہم اپنا مال دیتے ہیں اس لیے کہ ہمارا نام بلند ہو' اس پر ہمیں کوئی اجر ملے گا؟

حضورؐ نے فرمایا: نہیں۔

اس نے پوچھا: اگر اللہ کے اجر اور دنیا کی ناموری دونوں کی نیت ہو؟

آپؐ نے فرمایا: ان اللّٰہ تعالیٰ لا یقبل الا من اخلص لہ' اللہ تعالیٰ کوئی عمل بھی قبول نہیں کرتا جب تک وہ خالص اسی کے لیے نہ ہو۔

پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: الا للّٰہ الدین الخالص' خبردار دین خالص اللہ کا حق ہے۔

(تفہیم القرآن ' جلد ۴' ص ۳۵۷)

(خیر خواہ)

عالمی سرمایہ داری کا مستقبل

عبد القدیر سلیم

دوسری جنگ عظیم کے اختتام (۱۹۴۵) سے پہلے ہی تیسری جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہ سرد جنگ تھی، جو دنیا پر چالیس عشروں سے زیادہ عرصے تک مسلط رہی اور ۱۹۹۰ میں سوویت یونین کے انہدام کے بعد عملاً ختم ہو گئی۔ سی ڈبلیو ملز (C.W. Mills) کا خیال ہے کہ جنگ کے آخر میں امریکہ نے جاپان پر جن ایٹمی ہتھیاروں کے تجربے کیے تھے، وہ دراصل روس کے خلاف تھے۔ یہ روس کو انتباہ تھا کہ اسے اپنی حدود میں رہنا چاہیے، اور عالمی تسلط کی خواہش اور خواب کو ترک کر دینا چاہیے (The causes of Third World War)۔ جیسا کہ سب ہی جانتے ہیں، اس جنگ کے دو فریق تھے: نام نہاد "آزاد دنیا" جس کا سرخیل امریکہ تھا، اور اس کے اتحادی: مغربی یورپ اور برطانیہ تھے، اور دوسری طرف روس، مشرقی یورپ کے اشتراکی ممالک اور چین وغیرہ تھے۔

یہ دراصل دو معاشی، سیاسی فلسفوں کی جنگ تھی، دو نظریات کا ٹکراؤ تھا، جن کے ابتدائی مفکرین تو تاریخ کے گہرے دھندلکوں میں کہیں گم ہیں، لیکن ان کے موجودہ نمایندے انگلستان کا عیسائی مفکر، ایڈم اسمتھ (۱۷۲۳-۹۰) اور جرمنی کا یہودی نژاد انقلابی مفکر، کارل مارکس (۱۸۱۸-۸۳) تھے۔ ایڈم اسمتھ گلاسگو کی جامعہ میں اخلاقیات کا پروفیسر تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ معاشیات پر سائنسی انداز میں سب سے پہلے اس نے قلم اٹھایا، اور دولت اقوام (The Wealth of Nations) تصنیف کی۔ یہ کتاب جدید سرمایہ دارانہ معاشیات کی بائیبل تصور کی جاتی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ حرص اور خود غرضی چونکہ انسان کے خمیر میں شامل ہیں، اس لیے اگر تمام افراد کو اپنے اپنے مفادات کی تکمیل کی پوری پوری آزادی دے دی جائے تو سخت محنت کے نتیجے میں بالآخر دولت کی ریل پیل ہو گی، اور اس میں سب کا بھلا ہو گا۔ یہ آزاد تجارت اور منڈی کی معیشت کا پہلا منضبط فلسفہ تھا۔

کارل مارکس نے انسانی معاشرے اور معیشت کا ایک زیادہ عمیق اور انسان دوست فلسفہ پیش کیا۔ وہ تاریخ اور معاشروں کا جدلیاتی، طبقاتی تصور سامنے لایا، اور یہ نظریہ پیش کیا کہ دولت اور اشیا میں قدر،

دراصل محنت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ دولت آفرین، دراصل محنت کش مزدور ہے، جس کا ہر زمانے میں استحصال ہوتا رہا ہے۔ اب ایک انقلاب، جدلیاتی منطق کا تقاضا ہے، جس کے بعد: "ہر ایک سے اس کی صلاحیت کے مطابق اور ہر ایک کو اس کی ضرورت کے لحاظ سے" دیا جائے گا۔ اس نے دنیا بھر کے محنت کشوں کو صدا دی: "دنیا کے مزدورو! متحد ہو جاؤ، تمھارے پاس گنوا دینے کے لیے سوائے زنجیروں کے کچھ نہیں"۔

انیسویں صدی کا آخر اور بیسویں صدی کا نصف اول ان دو نظریات کے ٹکراؤ کی تاریخ کی داستان سے بھرا ہوا ہے۔ کارل مارکس اور اس کے ساتھیوں کی کوششوں سے بین الاقوامی اشتراکی تحریکیں وجود میں آئیں، اور نظام سرمایہ داری کے خلاف تلخ اور خونیں جدوجہد کا آغاز ہوا۔ ۱۹۱۷ میں روس میں پہلا اشتراکی انقلاب آیا۔ اسپین اور پھر دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر مشرقی یورپ کے بڑے حصے پر اشتراکیت کا تسلط ہو گیا، اور پھر چین، کیوبا اور بعض دوسرے علاقوں میں اشتراکیت فاتح بن کر ابھری۔

تاہم بیسویں صدی کا سرمایہ دار مغرب اب وہ نہیں رہا تھا، جو ایڈم اسمتھ، ٹی۔ایچ گرین (۱۸۳۶-۸۲، برطانوی فلسفی اور سیاسی، سماجی مصلح) اور مارکس کے عہد میں تھا۔ کچھ تو اشتراکی انقلابی تحریکوں کے خوف سے، اور کچھ دوسری اصلاحی اور انسان دوست تحریکوں کے زیر اثر، سرمایہ داری نے بھی اپنے منافع کا تھوڑا سا حصہ، محنت کشوں اور پس ماندہ عوام میں تقسیم کرنا شروع کر دیا تھا۔ نو آبادیات کے استحصالی کردار، نیز صنعت، تجارت اور سائنس کے فروغ سے یورپ، شمالی امریکہ، آسٹریلیا اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں خوش حالی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

تاہم ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ مغرب نے جس طرح کی سائنس، صنعت اور کاروبار کو فروغ دیا، اس کے نتیجے میں ایک زاویے سے دیکھیں تو انسان کی زندگی ابتر بھی ہوئی ہے۔ یا زیادہ صحیح یہ بات ہو گی کہ اس "ترقی" کے نتیجے میں باعتبار کیفیت، زندگی کو جتنا بہتر ہو جانا چاہیے تھا، وہ ویسی نہیں ہوئی۔

میرے خیال میں اس کی بڑی وجہ "نفع" کا وہ داعیہ ہے، جو آج کی معیشت کے کارخانے کی واحد قوت محرکہ ہے۔ سائنس، جدید فنیات اور انصرام (management) کے نئے اور بہتر کارگزار طریقوں کی وجہ سے پیداوار میں جو اضافہ ہوا ہے، اسے ٹھکانے لگانے کی بھی ضرورت پڑتی ہے (چاہے کسی کو اس اضافی مصنوع / "پیداوار" کی ضرورت ہو یا نہ ہو)، اور پھر بڑھتی اور "ترقی پذیر" معیشت کا تقاضا ہے کہ نئی نئی چیزیں بازار میں لائی جائیں (چاہے کسی کو اس "نئی مصنوع" کی ضرورت ہو یا نہ ہو)۔ پھر اس پیداوار کثیر اور نئی پیداوار (یہ دو مختلف چیزیں بھی ہو سکتی ہیں) کی نکاسی کے لیے صارفین میں ایک طلب پیدا کی جاتی ہے، اور انھیں باور کرایا جاتا ہے، اور احساس دلایا جاتا ہے کہ فی الواقع انھیں ان مصنوعات کی ضرورت ہے!

نئے معاشی نظام نے --- جو منڈی کی معیشت کے نام سے بیسویں صدی پر محیط نظر آتا ہے --- مغربی دنیا کے ملکوں میں یک گونہ خوش حالی میں اضافہ کیا (جو اٹھارویں، انیسویں صدی میں استعمار اور کمزور ملکوں کی براہ راست لوٹ کھسوٹ کے نتیجے میں پہلے ہی مادی ترقی کی راہ پر گامزن ہو گئے تھے، کیونکہ وہاں تعلیم اور تحقیق و ترقی کے لیے فاضل سرمایہ دستیاب تھا)۔ مگر دوسری جنگ عظیم کے بعد روایتی استعمار کے بتدریج خاتمے کے بعد اس خوش حالی اور لوٹ کھسوٹ کو جاری رکھنے کے لیے، دوسرے حربوں کی ضرورت تھی۔ منڈی کی معیشت کے فلسفے نے اس میں استحصالی طبقات کی پوری پوری مدد کی۔ یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ ان ممالک میں وسائل کے بے محابا استعمال (اور ضیاع) سے زندگی کی کیفیت میں جو بہتری نظر آتی ہے، اس میں اور وجوہ کے علاوہ، خود ان ملکوں کے کروڑوں محنت کشوں (یعنی عام شہریوں) کا استحصال بھی ہے، جو بہتر "زندگی" اور "زیادہ اشیاے صرف" کے لیے کولھو کے بیل کی طرح معاشی چکر سے باہر نہیں نکل سکتے اور ایک "معاشی حیوان" کے طور پر زندگی گزارنے پر مجبور کر دیے گئے ہیں۔ اس کے صلے میں انھیں جو اشیا / خدمات ملتی ہیں، انھیں بلند تر معیار زندگی کے اشارے بتایا جاتا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس صدی میں انسانوں کی اوسط عمر میں اضافہ ہوا ہے (خصوصاً مغربی یورپ اور شمالی امریکہ میں)، وہ بہتر کھاتے پیتے، پہنتے اوڑھتے اور رہتے ہیں۔ لیکن اس خوش حالی میں ایک بڑا عامل، دوسرے (اور کم "خوش نصیب") ملکوں کا استحصال بھی ہے، جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ تیسری دنیا کے ملکوں (پاکستان، بھارت، مصر، شرق اوسط اور افریقہ کے ممالک، وغیرہ) میں بھی مادی تبدیلیوں کی واضح تصویریں نظر آتی ہیں۔ ان ملکوں کو ہم دو اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں: ایک وہ ملک ہیں جہاں بعض معدنیات کی دریافت سے (جن کی مغرب کو سخت ضرورت رہتی ہے، مثلاً معدنی تیل) دولت میں بے پایاں اضافہ ہوا ہے۔ اس دولت سے وہ اشیا اور خدمات خریدی جاتی ہیں، جو ترقی کی علامت سمجھی جاتی ہیں۔ ایسے ممالک میں سعودی عرب، خلیج کی دوسری ریاستیں، برونائی اور بعض افریقی ملک شامل ہیں / تھے (مثلاً نائیجیریا، جو اس صدی کے وسط میں افریقہ کا ابھرتا ہوا آفتاب تھا، جو جلد ہی غروب ہو گیا)۔ دوسری طرف وہ ملک ہیں، جہاں آبادی کے تناسب سے اس "مفت کی" معدنی دولت کی ریل پیل نہیں (مثلاً بھارت، پاکستان، مصر اور بہت سے دوسرے "ترقی پذیر" ملک)۔ ان ملکوں میں بھی مادی تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ پاکستان ہی کو دیکھیے۔ آج ملک میں جتنی کاریں، ایئرکنڈیشنر، ٹی وی، ریڈیو، موٹر سائیکلیں، مہنگے اسکول اور شفاخانے اور اس طرح کی بہت سی چیزیں نظر آتی ہیں، جو اعلیٰ تر معیار زندگی کی علامت ہیں، اب سے ۳۰ سال پہلے وہ اس تعداد میں موجود نہ تھیں۔ ان سب میں آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ کیا یہ ترقی کے اشارے نہیں جو سرمایہ دارانہ معیشت نے فراہم کیے ہیں؟

اس سلسلے میں کئی باتیں قابل غور ہیں:

پہلی بات تو یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت (بازاری معیشت)، اور صنعت و فنیات کا داعیہ (imperative) ہی یہ ہے کہ ایسی مصنوعات کو زیادہ سے زیادہ پیدا کیا جائے (جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں، اس کے بغیر یہ نظام چل ہی نہیں سکتا)۔

دوسری بات یہ ہے کہ پیدائش بر پیمانہ کبیر کے بعد مسئلہ ان مصنوعات کی نکاسی اور انھیں ٹھکانے لگانے کا آتا ہے۔ اگر لوگوں میں سکت اور قوت خرید ہی نہ ہو، تو یہ اشیا فروخت کیوں کر ہوں گی، اور اگر فروخت نہ ہوں گی، تو پھر لامحالہ ان کی تیاری بھی بند کرنی ہو گی۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ صارفین کا ایک طبقہ پیدا کیا جائے، جو انھیں خریدنے کی استطاعت رکھتا ہو۔

تیسری بات یہ ہے کہ استطاعت کے ساتھ ساتھ لوگوں میں ان اشیا کے لیے ایک طلب بھی پیدا کی جائے کہ وہ ان کو خریدنے پر آمادہ ہوں۔ اگر انھیں ان کی ضرورت نہ ہو، تو ضرورت کو پیدا کیا جائے، خواہش نہ ہو، تو خواہش کو پیدا کیا جائے، اور پھر اسے فروغ دیا جائے۔ پرانا محاورہ تھا کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے، مگر اس نظام میں ایجاد، ضرورت کی ماں ہوتی ہے۔

غیر ضروری ضروریات (جن پر اب تیسری دنیا کے متوسط اور نچلے طبقے کے لوگ بھی کافی خرچ کر رہے ہیں)، میں صرف آرائش جمال، غازے، شیمپو، پرفیوم اور اس طرح کی درجنوں اشیا ہی شامل نہیں، جن سے ہمارے بازار اور دکانیں بھری پڑی ہیں، اور جن کی خریداری پر گھریلو میزانیے کا اچھا خاصا حصہ نکل جاتا ہے۔ ان اشیا میں وہ چیزیں بھی شامل ہیں، جو ہماری "کوڑا خوری" کی تسکین کا باعث ہوتی ہیں (junk food)[۱]، نرم مشروبات، شرابیں، سگریٹ وغیرہ۔ ان میں سے بعض چیزیں تو ہم (اور تیسری دنیا کے دوسرے ملک) براہ راست باہر سے درآمد کرتے ہیں، (سعودی عرب اور بہت سی خلیجی ریاستوں کے بازاروں کا تصور کیجیے، اور اگر یہ مشکل ہو، تو اپنے ہی ملکوں کے "باڑا بازاروں" کی سیر کیجیے) یا انھیں اپنے ملک میں تیار کر کے اپنے عوام کا معیار زندگی بلند کرتے ہیں۔[۲]

اب اگر بازاروں میں ان اشیا کی ریل پیل، اور عوام میں ان کا صرف ہی ترقی ہے، تو بے شک سرمایہ دارانہ نظام کے زیر سایہ ساری دنیا، اور تیسری دنیا کے بہت سے ملک بھی، ترقی کی دوڑ میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہیں۔

چوتھی بات یہ ہے کہ بہت سی اشیا کی ضرورت اس مخصوص صنعتی معیشت کی پیداوار ہے، جس میں زندگی گزارنے پر ہم مجبور کر دیے گئے ہیں۔ اسکوٹروں اور کاروں کی تعداد ہی کو لیجیے۔ موجودہ صنعتی نظام نے بیسویں صدی میں بڑے بڑے شہروں کو جنم دیا۔ قطع نظر اس کے کہ ان بڑے شہروں میں شور، گندگی،

فضائی اور برقیاتی آلودگی جیسے غیر مطلوب عواقب سامنے آئے' اب بڑے بڑے فاصلوں کے نتیجے میں ذرائع آمدورفت میں بے تحاشا اضافہ بھی ناگزیر ہو گیا' اور ان کے نتیجے میں مزید شور' آلودگی' حادثات' وقت کا ضیاع' کوفت اور پریشانیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔

بہرحال' سائنسی و فنیاتی ترقی اور معاشیات کے ایک مخصوص نظریے کے گٹھ جوڑ نے وہ دنیا تشکیل دی ہے جس میں آج ہم رہ رہے ہیں۔ اس میں وسائل کی فراوانی' ان کا بے محابا استعمال (اور ضیاع) بھی ہے' اور افلاس و محرومی بھی۔ غالب قوتوں کی قہاری بھی ہے' اور مغلوبوں کی مجبوری بھی' جو دنیا کے سیاسی نقشوں پر اپنی متعین سیاسی حدود میں بھی اپنے جہازوں کی پرواز' اپنی زرعی و صنعتی پیداوار کا تعین کرنے' اور اپنی فنیات کو ترقی دینے میں بھی آزاد نہیں' اگرچہ رسمی طور پر ان کا شمار "آزاد" ملکوں میں ہوتا ہے۔

مگر یہ سب کچھ اچانک نہیں ہو گیا۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں جوع الارض' استحصال اور نفع خوری کی جو گھٹائیں' بلاؤں کی صورت میں مغرب سے مشرق کی طرف امنڈتی آ رہی تھیں' بیسویں صدی میں انھوں نے واضح طور پر ایک متعین اور بلامزاحمت کام کرنے والے نظام کی صورت اختیار کر لی تھی۔ بائیں بازو کے دانش وروں نے اسے فوجی' صنعتی مرکب (military- industrial complex) کا نام دیا۔ مگر یہ صرف صنعت و فوج ہی کا گٹھ جوڑ نہ تھا۔ اس میں وہ سارے طبقے شامل ہو گئے' جو دفاع سے محروم یا کمزور عوام / اقوام سے ان کا حصہ چھیننے یا ان پر پلنے میں کسی تکلف کے روادار نہ تھے۔ اور وہ افراد بھی جو اپنی برتر "دانش"' "سائنسی یا دوسری صلاحیتوں" یا "علم و حرفت" کی بنا پر ایک طبقے کے بلند معیار زندگی کو دیکھ کر خود بھی اس گاڑی میں بیٹھ جانے کے آرزومند تھے' جو "کامیابی" کی شاہراہ پر رواں تھی۔ معاشی خوش حالی اور برتری ---- چاہے وہ کمزور قوموں کو میدان جنگ میں شکست دے کر اور عملاً ان کے علاقوں پر قابض ہو کر حاصل ہو' یا دوسرے طریقوں سے ان کے معدنی' زرعی اور انسانی وسائل کا استحصال کر کے ---- ساری تگ و دو کی اصل غایت قرار پائی۔ نو آبادیات کے اس دور میں صرف ملکوں ہی پر قبضہ نہیں کیا گیا' بلکہ ایشیا اور افریقہ کے باشندوں کو رسمی یا غیر رسمی طور پر غلام بنا کر ان کے خون پسینے کو زر' اشیا اور اپنے بلند معیار زندگی کے قالب میں ڈھالا جاتا رہا۔ (۳)

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں' مغرب' اور اس کے زیر اثر ایشیا' افریقہ اور لاطینی امریکہ کے تمام ملکوں میں جس مذہب کو فروغ ہوا' وہ نفع اندوزی کا مسلک (cult) تھا۔ انسان کی ساری تگ و دو کا مقصد ایک ہے: زیادہ سے زیادہ نفع۔ انیسویں صدی ہی میں صنعت و حرفت اور اس کے نتیجے میں سرمایہ داری کے فروغ کے ساتھ ساتھ اس کے بھیانک نتائج سامنے آنے لگے تھے۔ کارل مارکس اور اس کے پیش رو انسان دوست حکما

نے جو صدائے احتجاج بلند کی اور پستے ہوئے طبقوں کی حمایت کا جو بیڑا اٹھایا' اس کے نتیجے میں بالآخر ۱۹۱۷ کا وہ خونیں انقلاب رونما ہوا جس نے سرمایہ دار اور نوآبادیات پر قابض طبقوں میں کپکپی پیدا کر دی۔(۴) بیسویں صدی کا تقریباً تین چوتھائی اسی کشمکش کی نذر ہو گیا۔

لیکن انسانی عقل کے پیدا کردہ اس انقلاب کے پیچھے چونکہ کوئی درست فکری اساس نہ تھی اور یہ الہامی ہدایت سے بے بصر تھا' اس کا نتیجہ بھی یہی نکلا کہ ایک خطے میں (ساری دنیا میں نہیں) ایک استحصالی طبقے کے استیصال کے بعد ایک دوسرا استحصالی طبقہ وجود میں آ گیا' جو اپنے پیش رووں سے بھی زیادہ ظالم' جابر اور سفاک ثابت ہوا۔

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو' پھر کیا!
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

بیسویں صدی کے آخری عشرے کی ابتدا ہی میں بالآخر سوشلسٹ انقلاب کا اولین گہوارہ --- "سوویت یونین" --- ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں جو بین الاقوامی اشتراکی تحریکیں ایک ہمہ گیر انقلاب کا عزم لے کر اٹھی تھیں' منتشر ہو گئیں۔ کہا جانے لگا کہ یہ "سرمایہ دارانہ نظام" کی فتح ہے۔ بالآخر اس کا متبادل اور حریف نظام' جو ساری دنیا میں اس کی جگہ لینے کا دعوے دار تھا' فنا کے گھاٹ اتر گیا۔ سرمایہ داری کی فتح' دراصل "منڈی کی معیشت" کی فتح ہے اور منڈی کی معیشت کیا ہے؟ یہ کہ ہر شخص کو آزادی ہو کہ وہ اپنے نفع کو زیادہ سے زیادہ کر سکے۔ نفع کی تحریک (profit incentive) اور نفع کا محرک (profit motive) ہی اصل حقیقت قرار پائے۔ کہا جاتا ہے کہ یہی نظام معیشت ایک فطری نظام ہے' جو معیشت (اور "معاشی حیوان") کو مصنوعی جکڑبندیوں سے آزاد کرتا ہے' اور بالآخر اس کی فلاح کا ضامن ہے۔

لیکن اب' جبکہ سرمایہ دارانہ نظام کا کوئی قابل ذکر حریف باقی نہیں بچا ہے' دنیا کی صورت حال کیا ہے؟ ساری دنیا میں آزاد معیشت اور نج کاری کے دور میں دنیا کی آبادی کا ۲۰ فی صد حصہ غربت کی سطح سے بھی پست زندگی گزار رہا ہے' اور اس کے حصے میں دنیا کی کل دولت کا ۱ء۵ فی صد آتا ہے۔ غریب' غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ بڑھتی ہوئی غربت صرف تیسری دنیا کا ہی مسئلہ نہیں' ترقی یافتہ پہلی دنیا بھی اس میں مبتلا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا میں ہر روز ۳۵ ہزار مرد' عورت اور بچے بھوک سے مر جاتے ہیں جبکہ شمالی امریکہ اور مغربی یورپ میں غلے کے انبار' دودھ کی جھیلیں' مکھن کے پہاڑ اور گوشت کے ڈھیر ضائع کر دیے جاتے ہیں کہ قیمتیں کم نہ ہو جائیں۔ دنیا کے ۲۰ فی صد امرا' کل دولت کا ۵۰ فی صد سے زیادہ لے اڑتے ہیں' اور عالمی پیمانے پر ۰ء۵ فی صد افراد' ساری دنیا کے ۶۰ فی صد وسائل اور دولت پر قابض اور متصرف

ہیں۔ وقیع برطانوی جریدہ دی اکنامسٹ شکوہ کرتا ہے: "آج امریکہ اور برطانیہ میں آمدنیوں کا تفاوت جس سطح پر ہے' پچھلے ۵۰ سالوں میں کبھی اتنا نہیں رہا۔ دوسرے صنعتی ملکوں میں بھی پچھلے دو ایک عشروں میں امیر اور غریب کے درمیان خلیج میں اضافہ ہی ہوا ہے (اگرچہ ماضی میں بھی یہ تفاوت بہت تھا)۔ برطانیہ میں کمیشن برائے سماجی انصاف نے' جو (اس وقت کی) حزب اختلاف' لیبر پارٹی کے ایما پر قائم ہوا تھا' دولت کی ریل پیل کے درمیان غربت کی ایک بھیانک تصویر پیش کی ہے۔ اگرچہ مارکس کی یہ پیش گوئی ابھی تک پوری نہیں ہوئی کہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت پرولتاریہ انتہائی غربت کے قعر میں جا پڑیں گے' تاہم امیر اور غریب کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج بعض لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر رہی ہے' کہ مارکس آخر کار سچ ہی کہتا تھا" (۵ نومبر' ۹۶)۔

کیا استحصال کے نظام کی یہ موجودہ شکل' جس کا نام سرمایہ داری ہے (جس کا پیش رو' نو آبادیاتی نظام' اور اس سے پہلے جاگیرداری نظام تھا)' اسی شکل میں باقی رہے گی؟ ۹۰-۱۹۸۹ میں اشتراکیت کے زوال اور سوویت یونین کے انہدام کے بعد منڈی کی معیشت کے حامیوں اور عالموں نے پھر لوس لمن الملک بجانا شروع کر دیا ہے۔ لیکن مغرب ہی کے بعض دانش ور علماے معاشیات' سرمایہ داری کے موجودہ نظام کے ڈھانچے میں شکستگی کے آثار بھی دیکھ رہے ہیں۔ آج دنیا کی تین غالب معاشی قوتوں---- امریکہ' جاپان اور مغربی یورپ---- کے عالمی تسلط کے پیچھے ان کی کمزوریوں کو تلاش کرنا آسان نہیں۔ لیکن میساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے لسٹر تھوراؤ (Lester Thurow) کا خیال ہے کہ یہ نظام اپنے عروج کی بلندیوں کو چوم کر اب رجعت اور زوال کا رخ ہی کر سکتا ہے۔ ان کے خیال میں امریکہ کو ایک ایسی معیشت کی ضرورت ہے' جو اس کے اپنے شہریوں کی ضروریات کو پورا کرنے کا رجحان رکھتی ہو۔ کوئی بھی ملک' چاہے اس کی معیشت کا حجم امریکہ جتنا ہی کیوں نہ ہو' دائمی تجارتی خسارے کو نہیں سہار سکتا۔ وہ عالمی مالیاتی منڈیوں سے چاہے جتنا قرض لے لے' اور اپنے تاجرانہ ہتھکنڈوں سے عالمی بازاروں کو چاہے جتنی چترائی سے زیر و زبر کرتا رہے' اہل بازار کی بھی اپنی ایک منطق ہے' اور اس کا حشر بالآخر میکسیکو سے مختلف نہیں ہو گا۔ جاپانی معیشت' حد سے زیادہ گرم ہو کر پہلے ہی آمادۂ زوال ہے۔ اور مغربی یورپ میں معاشی زوال کے آثار پہلے ہی نمایاں ہو چکے ہیں' کیونکہ ۱۰ فی صد بے روزگاری اب معیشت کی ساخت کا معمول بن گئی ہے' کیونکہ ترقی یافتہ ممالک کے اعلیٰ مہارتوں کا تقاضا کرنے والے معاشی میدان میں کم ہنر مندوں / بے ہنر لوگوں کے لیے کوئی مقام نہیں رہا۔[5]

"دنیا کی معیشت ایسی ڈرامائی تبدیلیوں سے دوچار ہے جسے ارتقائی حیاتیات سے ایک استعارہ لے کر ہی واضح کیا جا سکتا ہے' اور وہ ہے "موقوفی توازن" (punctuated · equilibrium)۔ ارتقائی تاریخ کے ان

ادوار میں ہوتا یہ ہے کہ طبعی ماحول میں اچانک ایسی زبردست بنیادی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں کہ غالب نوع (حیوانی) سرعت کے ساتھ فنا کا شکار ہو جاتی ہے' اور اس کی جگہ ایک دوسری نوع نمودار ہو جاتی ہے۔ اس کی سب سے اچھی مثال جو ہمیں معلوم ہے' ڈائنوسار (گرگٹ نما مہیب عظیم الجثہ حیوانات) کی نابودگی ہے۔ انھوں نے ۱۳۰ ملین (۱۳ کروڑ) سال کرۂ ارض پر حکمرانی کی' اور پھر اچانک فنا ہو گئے..." (دی اکنومسٹ' ۹ مارچ' ۹۶)۔

تھوراؤ نے معاشیات کی دنیا میں موسموں کی اچانک تبدیلیوں کے پانچ عوامل بتائے ہیں: "اولاً' اشتراکیت کا خاتمہ' جس کے نتیجے میں انسانی آبادی کا ایک تہائی حصہ' جو کرۂ ارض کے ایک چوتھائی رقبے پر پھیلا ہوا تھا' اچانک ایک مختلف نظام (سرمایہ داری) کی طرف دوڑ پڑا۔ دوسرے' فنیاتی انقلاب' جس میں انسانی ساختہ دماغی قوت (کمپیوٹر انفارمیشن ٹیکنالوجی یا اطلاعی فنیات) کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ تیسرے' انسانی آبادی کا ایک بالکل نیا منظر' جس میں دیکھنے میں یہ آ رہا ہے کہ دنیا کے غریب ترین ملکوں میں آبادی دھماکہ خیز شرح کے ساتھ بڑھ رہی ہے' اور امیر ملکوں میں نسبتاً خوش حال بوڑھے لوگ اپنی آمدنی کے لیے پیرانہ سالی کے سرکاری وظائف پر پل رہے ہیں (کام کے بغیر عیش!)۔ چوتھے' ایک عالمی معیشت کا فروغ' جہاں ملک ٹوٹ رہے ہیں' جبکہ علاقائی تجارتی بلاک نشوونما پا رہے ہیں' اور بڑے بڑے کاروبار ایک دوسرے سے پیوست ہوتے جا رہے ہیں۔ اور پانچویں یہ کہ دنیا ایک نئی صدی میں داخل ہو رہی ہے' جہاں کوئی غالب' معاشی' سیاسی اور فوجی طاقت کا وجود نہیں رہے گا۔

متذکرہ پانچ عوامل پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ ان کے علاوہ چند اور عوامل بھی ہیں' جو عالمی اقتصادی منظر پر اثرانداز ہو رہے ہیں۔ اولاً یہ کہ ساری دنیا میں' خصوصاً "ترقی پذیر" ممالک میں اسلحہ کی تیاری' خریداری اور فوجی اسٹیبلشمنٹ کے اخراجات بڑھتے جا رہے ہیں' بعض ملکوں میں یہ اتنے زیادہ ہو گئے ہیں کہ تعلیم' معالجے اور دوسرے ضروری اخراجات کے لیے کچھ بچتا ہی نہیں۔

ثانیاً' ساری دنیا' خصوصاً تیسری دنیا اور غریب ملکوں میں ریاست اپنی ان ذمہ داریوں سے دست کش ہوتی جا رہی ہے' جو روایتاً" صدیوں سے اسی کا حصہ تصور کیے جاتے تھے۔ ان میں سرفہرست' تعلیم' صحت عامہ' روزگار اور شہری امن و امان کا قیام / تحفظ جیسی ذمہ داریاں شامل ہیں۔ اور ثالثاً ساری دنیا میں (خصوصاً مسلم ملکوں میں) اسلام کے حوالے سے "انقلابی تحریکیں" برپا ہو رہی ہیں' جو سارے مروج نظاموں کے خلاف ہیں' اور خصوصاً مغرب کے سیاسی' اقتصادی اور فکری غلبے کے خلاف معاندانہ جذبات رکھتی ہیں' اور انھیں تلپٹ کر دینے کے عزم کا برملا اظہار کرتی ہیں۔ یہ اس صدی کے وسط کے منظر سے مختلف صورت حال ہے۔ جب بڑھتی ہوئی اشتراکی قوتوں کے خلاف مغربی اور دینی عناصر اپنے مشترکہ مفادات کے تحت گٹھ

جوڑ میں مصروف نظر آتے تھے۔

معاشیات کے حوالے سے عالمی منظر پر اس طائرانہ نگاہ کے بعد اب تھوراؤ کے تجزیے کی طرف آیئے۔

اگرچہ تھوراؤ کے اس پورے تجزیے سے کلی اتفاق نہیں کیا جا سکتا' مثلاً اس کی یہ پیش گوئی کہ اگلی صدی میں دنیا میں کوئی غالب معاشی' سیاسی قوت نہ رہے گی۔ نظر تو یہ آتا ہے معاشی' سیاسی' فوجی قوتوں' علوم کے بہت سے شعبوں میں اختصاص رکھنے والے ماہرین اور اسٹیبلشمنٹ کے دانش وروں (عہد قدیم کے جادوگروں اور سامریوں کے جانشین) کے مفادات کے تانے بانے ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔ اس لیے عوام پر ان کی گرفت بھی مضبوط ہے' اور ہوتی جا رہی ہے۔ مستقبل' جہاں تک ہمیں نظر آتا ہے' سرمایہ فنیات' سائنس' انصرام (managements) اور اطلاعاتی فنیات کے مزید ارتکازات کا ہے' اور ان ارتکازات کے نتیجے میں ایک عام انسان مزید جتنا لاچار اور بے بس ہو جائے گا' انسانی آبادی کی اکثریت اپنی تاریخ میں کبھی اس دور سے نہ گزری ہو گی۔

جب غیب کی بجائے حاضر و موجود' آخرت کی بجائے عاجلہ اور روح کی بجائے جسم و مادہ اصل حقیقت اور توجہ و جہد کا ہدف قرار پائیں' تو پھر جن کے پاس زیادہ علم و اطلاع ہوں گے' انھیں زیادہ عیاری سے' جن کے پاس زیادہ صلاحیت ہو گی' انھیں زیادہ غلبے سے' اور جن کے پاس زیادہ قوت ہو گی' انھیں سفاکی سے روکنے والی چیز آخر کیا ہو گی؟ اور جب یہ ساری قوتیں اور صلاحیتیں یکجا ہوں گی' تو ان کا مآل کار کیا ہو گا؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ آیندہ صدی کے آخر تک شاید ملکوں کی سیاسی حدود بڑی حد تک بے معنی ہو جائیں'[٦] لیکن شاید غالب و مغلوب کے تفاوت میں اضافہ ہی ہو گا' سوائے اس کے کہ ویسا ہی کوئی انقلاب واقع ہو' جس نے عظیم الجثہ گرگٹوں کو نابود کر دیا تھا۔ ماضی میں ایسا انقلاب' جس نے انسانوں کو انسانوں اور دیوتاؤں کی غلامی سے چھڑایا تھا' ان کی زنجیریں کاٹ دی تھیں' ان کی پیٹھ سے ان کا بوجھ ہٹا دیا تھا' اور ان کی روح' فکر اور عمل کو آزادی بخشی تھی' محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ہی آیا تھا[٧]۔ معاشیات کی دنیا میں دولت کی گردش کا فلسفہ: كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ (الحشر ۵۹:۷) تاکہ زر تمھارے مال داروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے' اسلام ہی نے دیا تھا۔ زر پرستی کو جہنم کی خوش خبری دی گئی تھی' اور وسائل کی منصفانہ تقسیم کا حکم دیا تھا کہ فراوانی کے درمیان کوئی محرومی کا شکار نہ ہو' کسی شکم سیر کے پڑوس میں کوئی بھوکا نہ سوئے' وجہ افتخار' امارت نہیں' فقر اور درویشی ہو۔ ان' یا دوسری تعلیمات کو لے کر اب کسی نبی کو تو نہیں آنا ہے' لیکن آپؐ کے علم و حکمت کے صحیح اطلاق کے ذریعے ہی کسی مثبت اور بامعنی تبدیلی کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ ایک نوع حیوانی کے فنا ہو جانے کے بعد دنیا دوسری بدتر نوع حیوانی سے آباد ہو جائے گی۔

حواشی:

۱- "کن ٹکی فرائڈ چکن" کوکاکولا' پیپسی' کئی طرح کی آئس کریم' ٹافیاں' چاکلیٹ' بسکٹ اور اس طرح کی بہت سی چیزیں یا تو باہر سے آتی ہیں' یا غیر ملکی تجارتی شراکتوں سے تیار ہوتی ہیں' جن کے منافع کا ایک حصہ بہرحال باہر منتقل ہو جاتا ہے۔

۲- یہ بات نوٹ کیے جانے کے قابل ہے کہ پچھلے عشرے میں کراچی' لاہور جیسے شہروں میں جن صنعتوں کو سب سے زیادہ فروغ ہوا' وہ ڈبل روٹی' بسکٹ' ٹافیوں اور آئس کریموں جیسی صنعتیں ہیں۔

۳- افریقہ سے آزاد انسانوں کو پکڑ کر زبردستی غلام بنا لینے کا رواج ختم ہوا' تو بیسویں صدی کے وسط میں ایک دوسری غلامی کا آغاز ہوا۔ غلامی کے اس دور نو میں غلام (چاہے وہ سائنس دان ہو' یا اپنے شعبہ علم و فن میں اختصاص رکھنے والا کوئی ماہر)' وہ بہرحال خود دوڑ کر اپنے آقاؤں کے پاس پہنچنے کی آرزو کرتا ہے' تاکہ کسی طرح ان کے ساتھ / ان کے لیے' کام کرے۔ تیسری دنیا سے صلاحیتوں کا یہ نکاس' تیسری دنیا کی غربت کے باعث بھی ہے اور اس کا باعث بھی۔

۴- یہ بات نوٹ کیے جانے کے لائق ہے کہ سرمایہ دار ممالک کے سبھی عوام "سرمایہ داری" اور "نو آبادیاتی نظام" کی برکتوں سے فیض یاب نہیں تھے۔ اور نہ اب ہیں۔ ان ممالک میں بھی ان انقلابی تحریکوں سے اصل خطرہ ان بالادست طبقوں کو تھا' جو اقتدار کے جھولے میں پینگیں لے رہے تھے۔ جب اہل سرمایہ و اقتدار نے اپنے نظام کے لیے درپیش خطرات کی بو سونگھ لی' تو انھوں نے اپنے ہاں وہ "اصلاحات" شروع کر دیں جن سے مزدوروں اور دوسرے محنت کش طبقات کو اپنی محنت کا کچھ بہتر صلہ --- اور نتیجے میں ایک بہتر "معیار زندگی" ملنے لگا۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
(اقبال)

اور "مطمئن" و "آسودہ" چوپایوں کی یہ افواج پھر خوشی خوشی اپنے کاموں میں جت گئیں۔

۵- یہ بات دلچسپی سے نوٹ کیے جانے کے قابل ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی معیشت' امریکہ میں جہاں فی کس کل قومی پیداوار میں ۱۹۷۳ اور ۱۹۹۵ کے درمیان ۳۶ فی صد اضافہ ہوا ہے' نچلے درجے کے کارکنوں (محنت کشوں) کی حقیقی اجرت میں ۱۴ فی صد کمی ہوئی ہے۔ یعنی انھیں اپنے ملک کی بڑھتی ہوئی خوش حالی میں زیادہ حصہ تو کیا ملتا (جو اصولاً پس ماندہ طبقات کو ملنا چاہیے کہ آسودہ طبقے کے پاس تو پہلے ہی ضرورت سے زیادہ تھا)' ان کا حصہ اور کم ہو گیا۔ ۱۹۸۰ کے عشرے میں زائد آمدنیوں کے سارے فوائد' کارگزاروں کے بالائی ۲۰ فی صد طبقے کے حصے میں آئے اور زائد آمدنیوں کا ۶۴ فی صد حصہ' چوٹی پر براجمان ایک فی صد کا حق ٹھہرا۔ دی اکونومسٹ' لندن' ۹ مارچ' ۱۹۹۶)۔

۶- دیکھیے: پال کینڈی (Paul Kennedy) کی کتاب: Preparing for the Twenty-First Century' Fontana Books ۱۹۹۵ میں اس کا مضمون: The Future of Nation State۔

۷- [محمد صلی اللہ علیہ وسلم] انھیں معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں' پاک چیزیں ان کے لیے حلال کرتے ہیں' اور خبیث چیزیں ان پر حرام کرتے ہیں' اور ان کا بوجھ ان پر سے ہٹا دیتے ہیں' اور وہ زنجیریں بھی جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے"۔ (الاعراف ۷:۱۵۷)

حجاب اور اجتماعی سرگرمیاں

مولانا گوہر رحمٰن

ڈاکٹر انیس احمد

چہرے کے پردے، خاندانی زندگی میں حجاب کے آداب و حدود اور اجتماعی اور دعوتی سرگرمیوں میں عورتوں کی شرکت کے بارے میں سوالات برابر آتے رہتے ہیں۔ اس سے پہلے مدیر **ترجمان القرآن** خرم مراد مرحوم نے **ترجمان القرآن** (رسائل و مسائل نومبر ۱۹۹۶) میں ایک تحریکی بہن کے جواب میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا جس پر ایک دوسری بہن نے گیارہ سوالات قائم کیے ہیں اور ان کے بارے میں رہنمائی چاہی۔ ہم نے ان سوالات کے بارے میں محترم مولانا گوہر رحمٰن صاحب اور جناب ڈاکٹر انیس احمد کو اظہار خیال کی دعوت دی۔ دونوں کے جوابات شائع کیے جا رہے ہیں۔ ان میں اصل مسائل کے بارے میں بڑی دقت نظر سے، گو بڑے اختصار کے ساتھ، تمام ہی اہم پہلوؤں کا (بشمول اختلافی آرا) احاطہ کر لیا گیا ہے۔ نیز احکام کی تشریح و تعبیر اور حالات پر ان کی تطبیق کے باب میں بھی بڑی مفید رہنمائی فراہم کی گئی ہے۔ "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است!" انداز بیان اور تفہیم و تعبیر احکام میں اختلاف کے باوجود مقصد کے تعین اور غور و فکر کے انداز میں اشتراک و اتفاق بھی اس تحقیق و تجزیہ کا ایک پہلو ہے۔ ان دونوں نقطہ ہاے نظر کی اشاعت کا مقصد کسی بحث کو جنم دینا نہیں بلکہ غور و فکر کے جملہ پہلوؤں کو پوری علمی متانت کے ساتھ قارئین تک پہنچانا ہے اور انھیں دین حق کے احکام و آداب اور اپنے ضمیر کے مطابق فکر و عمل کی دعوت دینا ہے۔ دیانت اور اخلاص پر مبنی اختلاف بھی ہماری روایت کا اسی طرح ایک درخشاں حصہ ہے جس طرح اتفاق اور اجماع۔ چونکہ مزید بحث پیش نظر نہیں اس لیے مزید سوال و جواب کے لیے بلاواسطہ اہل علم سے خط و کتابت کا راستہ اختیار کیا جائے۔ **ترجمان القرآن** کے صفحات پر اب اس گفتگو کو مزید آگے بڑھانا ممکن نہیں۔ (مدیر)

۱۔ آپ نے لکھا ہے کہ چہرے کے پردے کے بغیر سامنے آنے کے بکثرت نظائر موجود ہیں جن کو جمع کر دیا گیا ہے۔ کتابوں کے نام و مصنفین سے آگاہ کیجیے تاکہ براہ راست استفادہ کیا جا سکے؟

۲۔ کیا آپ کے خیال میں چہرہ' عورت کی سب سے بڑی زینت نہیں؟

۳۔ کیا چہرہ کھول کر ہی خاندانی روابط کو جوڑا جا سکتا ہے؟ بہت سی ایسی خواتین بھی دیکھی ہیں جو گھونگھٹ کی طرح پلو لٹکا کر بہترین خاندانی روابط نبھا رہی ہیں۔ شریعت کی رو سے کون سا طریقہ زیادہ پسندیدہ اور مطلوب و مقصود ہے؟

۴۔ آج کے معاشرے میں جس طرح چہرے کا پردہ کرنے سے خاندانی روابط کے سرد پڑ جانے کا خدشہ ہے بعینہ عورت کے علیحدہ گھر کے مطالبے سے بھی خاندانی روابط کے منقطع ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ لہٰذا اولین ترجیح حکم شرعی کو دی جانی چاہیے یا افراد کی پسند کو جو لاعلمی اور معاشرتی و اخلاقی تنزل کی وجہ سے کافی حد تک غیر اسلامی ہو چکی ہے۔ جو عورت خود دوسروں کے "مؤذ' پسند' روایات کو دیکھ کر اسلامی احکامات میں گنجائش اور رخصتیں نکالتی چلی جائے گی کیا اس کی تبلیغ موثر ہو سکتی ہے؟ دوسروں کو بدلنے کے لیے خود اسلامی احکامات پر استقامت لازمی ہے ورنہ نتائج منفی ہی رہتے ہیں۔ میرے مشاہدے کی حد تک تو یہی صورت حال ہے۔

۵۔ امربالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی کے لیے بھی آپ کے نزدیک چہرے کا پردہ رکاوٹ ہے۔ لیکن جس طرح عام معاشرے میں مرد' مردوں میں اور عورتیں عورتوں میں یہ فرض ادا کرتی ہیں' کیا خاندان کے اندر بھی یہی اصول کار فرما نہیں ہونا چاہیے؟ اور اگر بالفرض کوئی ایسی ناگزیر صورت درپیش ہو تو کیا فون اور خط کے ذریعے یہ فرض ادا کرنا' حیا اور نسوانیت کے تقدس کے لحاظ سے زیادہ بہتر اور پسندیدہ نہیں؟

۶۔ سگے ماموں اور چچا تک سے چہرے کے پردے میں غلو کی سمجھ تو آتی ہے لیکن کیا آپ کے خیال میں جوان چچا زاد' پھوپھی زاد' خالہ زاد' ماموں زاد بھائیوں سے چہرے کو بہت زیادہ open نہ کرنا بھی "غلو" میں داخل ہے؟

۷۔ اگر کچھ لوگ غیر مسلموں سے مشابہت' وقت' پیسے کے ضیاع اور لغویات میں پڑنے سے اجتناب کی بنا پر بعض "ملبوسات اور رسومات" سے اجتناب کرتے ہیں تو کیا یہ بھی دین میں "غلو" ہوگا؟

۸۔ اگر کوئی خاتون رخصتوں سے فائدہ اٹھانے کے بجائے عزیمت کی راہ اختیار کرنا چاہے تو آپ کے خیال میں اسے اس پر ابھارنا چاہیے یا رخصتوں اور گنجائشوں کا عادی بنانا چاہیے؟

۹۔ آپ نے لکھا ہے کہ: "چہرے کا پردہ اختلافی ہے' یہ معروف بات ہے" لیکن میں نے تو ایم اے کے دوران جتنی بھی تفاسیر اور کتابیں اس موضوع پر پڑھی ہیں ان میں یہی پڑھا ہے کہ: "چہرے کے پردے کو ہمیشہ اختلافی بنایا جاتا رہا حالانکہ یہ نص قطعی سے ثابت ہے!"

۱۰۔ دور نبویؐ میں مشترک مذہبی اجتماعات کی مثالیں تو ملتی ہیں جہاں خواتین سامع کی حیثیت سے دینی تعلیم حاصل کرتی تھیں لیکن "مشترک سیاسی اجتماعات" کی کوئی مثال ہو تو بتایئے آج کل جو مظاہرے' دھرنے' ریلیاں

ہو رہی ہیں' کیا اس کا جواز شریعت میں ہے؟

۱۱- ایک مسلم خاتون جسے اپنی ذات' گھربار' اڑوس پڑوس' عزیز و اقارب' میں دین کی خدمت انجام دینا ہے' جملہ گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ --- کیا وہ دنیا بھر کی تحریکی ساتھیوں کے ساتھ مل کر بھی کام کرنے کی مکلف ہے؟ مغرب کی طرح کیا اسلام بھی ایسی "مشینی خاتون" کا تصور دیتا ہے؟ اور کیا اس سے خاندانی نظام کمزور نہیں ہوتا' جس طرح مغرب میں ہوا---؟ اسلام میں ایسی گنجایشوں کا نکالنا مباح ہے یا حرام؟

مولانا گوہر رحمٰن

سوالات کے جوابات تحریر کرنے سے قبل چند متفقہ و مسلمہ قواعد کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے تاکہ جوابات کو سمجھنے میں ان کو مدنظر رکھا جائے۔ ان قواعد کے دلائل بیان کرنا اور ان کی تحقیق و تفصیل پیش کرنا ضروری نہیں ہے' صرف اشارات کافی ہیں جو یہ ہیں:

۱- فہم قرآن اور فہم حدیث کے لیے صحابہؓ و تابعینؒ اور دوسرے سلف صالحینؒ کی تحقیقات و تشریحات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

۲- قرآن و سنت اور سلفؒ کی تشریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کا دائرہ کار بھی محدود ہے اور طریق کار بھی مخصوص ہے۔ اسی طرح کچھ فرائض ایسے بھی ہیں جو عورتوں کی ذمہ داری نہیں ہیں بلکہ مردوں کی ذمہ داری ہیں۔ اس لیے اپنے اصل فرائض کو چھوڑ کر اور تقسیم کار کے اصول کو توڑ کر مردوں کے دائرہ کار میں داخل ہونا حدود اللہ سے تجاوز کرنا ہے۔

۳- ضرورت و مصلحت کے تحت دی گئی وقتی رخصتوں کو مستقل حکم شرعی بنانا اور معمول کے حالات کے لیے بطور نظیر پیش کرنا جائز نہیں ہے۔

۴- دین یقیناً آسان ہے لیکن اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ حالات و عادات کی وجہ سے جو حکم لوگوں کو مشکل نظر آ رہا ہو' اس کو آسان بنا دو' بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا دین آسان ہے' اس پر عمل کرو اور اپنی طرف سے اس کو مشکل نہ بناؤ۔ اصل حکم شرعی ٹھیک ٹھیک بتا دیا جائے تاکہ آیندہ نسلوں تک دین کے احکام منتقل ہوتے رہیں۔ اگر کوئی شخص اپنی مجبوری یا کمزوری کی وجہ سے اس پر عمل نہ کر سکا تو معافی کی امید تو کی جانی چاہیے لیکن دینی احکام کو لوگوں کی عادت اور طبیعت کے تابع بنانا بہت بڑا جرم ہے۔

۵- اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہے بلکہ کھلا ہے اور اہلیت رکھنے والوں کے لیے اجتہاد کرنا ضروری بھی ہے لیکن نصوص اور ان کی اجماعی تعبیر کے خلاف اجتہاد کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔

۶- جو احکام عرف پر مبنی ہوں' وہ عرف کے بدلنے سے بدل جاتے ہیں لیکن جو احکام نصوص پر مبنی ہوں' وہ عرف کے بدلنے سے نہیں بدلے جا سکتے۔

۷ - مباح بلکہ مستحسن کام بھی اگر شرعی مفاسد کا ذریعہ بن سکتے ہوں تو وہ ممنوع ہو جاتے ہیں اور قانون سدِّ ذریعہ کے تحت ان پر پابندی لگائی جا سکتی ہے۔

۸ - غلو کے معنی ہیں حد سے آگے نکلنا۔ اس مفہوم کے لحاظ سے خواتین کو اپنے اصل دائرہ کار سے نکال کر مردوں کے دائرہ کار میں لانا بھی غلو ہے اور ان پر غیر شرعی پابندیاں لگانا بھی غلو ہے۔

۹ - اختلافی مسائل میں ضرورت و مصلحت کی بنا پر مسلک راجح کو چھوڑ کر مسلک مرجوح پر بھی اخلاص نیت کے ساتھ عمل کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ ضرورت حقیقی ہو۔

۱۰ - اختلافی مسئلہ وہ ہوتا ہے جو دور صحابہؓ سے اختلافی چلا آ رہا ہو۔ وہ مسئلہ اختلافی نہیں کہلایا جا سکتا جس کو دور حاضر کے متجددین نے اختلافی بنا لیا ہو۔ البتہ نئے مسائل کے حل کے لیے نیا اجتہاد کیا جا سکتا ہے اور کرنا چاہیے!

ان عشرۂ کاملہ کے بعد اب اصل سوالات کے جوابات ملاحظہ فرمایئے اور عمل کرنے کا عزم کیجیے۔

سوالنامے میں پوچھے گئے گیارہ سوالات دراصل تین مسائل سے تعلق رکھتے ہیں، ایک ہے چہرے کا پردہ، دوسرا ہے غیر محرم رشتے داروں سے پردہ اور تیسرا مسئلہ ہے خواتین کا کھلے عام مظاہرے کرنا۔ ان تین مسائل کی تنقیح و توضیح سے ان شا اللہ استفسار کرنے والی محترم خاتون کی تشفی ہو جائے گی۔ میں اپنے جوابات کو انھی مسائل تک محدود رکھوں گا اس لیے کہ یہی پوچھے گئے ہیں۔

چہرے کا پردہ

(۱) موجودہ بگڑے ہوئے معاشرے میں خواتین کے لیے غیر محرم مردوں کے سامنے چہرہ کھولنا ممنوع ہے۔ البتہ شریعت میں دی گئی استثنائی صورتوں میں چہرہ کھولنے کی بقدر ضرورت اجازت ہے۔ دلائل کا خلاصہ یہ ہے:

ابتدائے اسلام میں چہرہ غیر محرم مردوں کے سامنے کھولنا جائز تھا۔ ہجرت کے بعد ذوالقعدہ ۵ھ میں حجاب کے بارے میں یہ حکم نازل ہوا، وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْــَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَاۗءِ حِجَابٍ ۭ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ (الاحزاب ۳۳:۵۳)، "جب تم ان سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو۔ یہ تمھارے دلوں اور ان کے دلوں کو پاک و صاف رکھنے کا موثر ترین ذریعہ ہے"۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ حجاب کا یہ حکم امہات المومنین یعنی ازواج رسولؐ کے لیے تھا اور اس کی علت ان کا اکرام و احترام تھا، ان کی یہ بات آیت کے سیاق اور نظم کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حجاب کے حکم کی علت ازواج رسولؐ کا احترام و اکرام نہیں بتائی اگرچہ یہ تقاضائے ایمان ہے، بلکہ قلوب کی طہارت کو اصل علت قرار دیا ہے، جس کی ضرورت امت کی عام خواتین کے لیے امہات المومنین اور صحابیات کے مقابلے

میں زیادہ ہے۔ اس لیے کہ ان کے دلوں میں کجی اور کھوٹ پیدا ہونے کا خطرہ زیادہ ہے۔ اس حکم کی مزید تاکید کے لیے یہ آیت بھی نازل ہوئی: "اور گھروں ہی میں ٹھہری رہو اور جاہلیت کے پہلے دور کی طرح اپنی زینت و زیبائش کو نمایاں نہ کرو" (الاحزاب ۳۳:۳۳)۔ اس حکم کا تقاضا تو یہ ہے کہ عورتیں گھروں سے باہر نہ نکلیں لیکن اسی آیت کے اگلے حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم کا منشا اپنی زینت کو نمایاں کرنے اور اس کی نمایش کے لیے گھروں سے نکلنے کی ممانعت کرنا ہے۔ دینی اور معاشرتی و معاشی ضروریات کے لیے نکلنے کی ممانعت کرنا مقصد نہیں ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ: قد اذن اللہ لکن ان تخرجن لحوائجکن (صحیح بخاری کتاب النکاح باب خروج النساء لحوائجھن)، "اللہ نے تم کو اپنی ضروریات کے لیے گھروں سے نکلنے کی اجازت دے دی ہے"۔

اس آیت اور اس کی تشریح میں ارشاد رسولؐ سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ عورت کے لیے اصل حکم قرار فی البیوت کا ہے اور اس کا دائرہ کار اور میدان عمل اس کا گھر ہے لیکن اس کو اپنے دینی فرائض ادا کرنے یا اپنی دنیوی حوائج کے لیے بوقت ضرورت اور بقدر ضرورت گھر سے باہر جانے کی اجازت دے دی گئی ہے بلکہ بعض حالات میں گھر سے نکلنے کو واجب بھی قرار دیا گیا ہے۔ لیکن گھروں سے نکلنے اور بیرون خانہ حوائج پوری کرنے یا دینی فرائض ادا کرنے والی خواتین کو بھی پردے کا حکم دیا گیا ہے: "اے نبیؐ اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں" (الاحزاب ۳۳:۵۹)۔

اس آیت میں چادر کا پلّو لٹکانے کے معنی کیا ہیں؟ اس کا جواب دور صحابہؓ کے بہت بڑے مفسر قرآن اور ترجمان القرآن، عبداللہ ابن عباسؓ نے اس طرح دیا ہے کہ: "چادر کو پیشانی پر مضبوطی کے ساتھ چپکا کر اس کا ایک پلو ناک پر اس طرح لٹکا دے کہ آنکھیں اگرچہ کھلی رہیں مگر سینے اور چہرے کا اکثر حصہ چھپ جائے" (ابن جریر، سورۃ الاحزاب، آیت ۵۹)۔

ابن عباسؓ عربی زبان کے ماہر تھے اور فہم قرآن و حدیث کی بھی خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت کی اسی تعبیر و تفسیر کی بنیاد پر امام جصاصؒ، قاضی ابن العربیؒ، ابن جوزیؒ، امام رازیؒ، قرطبیؒ، ابن عطیہؒ، غرناطیؒ، ابوحیان اندلسیؒ، ابن کثیرؒ، نیشاپوریؒ، مظھری، ابو السعود اور دوسرے مفسرین نے آیت کا یہی مفہوم بیان کیا ہے کہ غیر محرم مردوں سے چہرے کا پردہ ضروری ہے۔ دور حاضر کے اردو مفسرین میں سے مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی محمد شفیعؒ، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، پیر کرم شاہ الازہری، مولانا مودودیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی نے بھی اسی طرح لکھا ہے کہ اس آیت سے چہرے کا پردہ ثابت ہوتا ہے۔ (ملاحظہ کیجیے ان مفسرین کی تفاسیر میں سورہ الاحزاب، آیت ۵۹)۔

اس آیت کے نزول اور حجاب و نقاب کے حکم کے نفاذ کے بعد مسلمان عورتیں اپنا جسم اور چہرہ چھپا کر اس طرح نکلتی تھیں کہ صرف آنکھیں دیکھنے کے لیے کھلی رہتی تھیں۔ اصل شرعی حکم یہی ہے جو مذکورہ آیت سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے۔ اگر اس حکم کے خلاف کچھ نظائر دور صحابہ میں ملتے ہیں تو وہ حجاب و نقاب کے احکام نافذ ہونے سے پہلے کے ہوں گے یا کسی استثنائی صورت اور ضرورت سے متعلق ہوں گے یا پھر بعض خواتین کی شخصی بے احتیاطیاں ہوں گی۔ اس لیے ان نظائر سے قرآن کا مذکورہ حکم نہ منسوخ ہو سکتا ہے اور نہ اس میں ترمیم ہو سکتی ہے۔ قانون کے فہم میں اصل چیز اس کے الفاظ ہوتے ہیں اور اس کی تعبیر میں مستند ماہرین قانون ہی پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ معاشرے کے کچھ افراد کا عمل قانون کی تعبیر کے لیے بطور دلیل نہیں پیش کیا جا سکتا اگرچہ وہ قرون اولیٰ کا معاشرہ ہو۔ اس لیے کہ اچھے سے اچھے معاشرے میں بھی ضرورت و مجبوری کی وجہ سے یا بشری کمزوری کی وجہ سے قانون کی خلاف ورزی کی مثالیں مل سکتی ہیں۔ البتہ اگر صحابہ کرامؓ کا عام تعامل اور اجماع موجود ہو کہ چہرے کا پردہ ضروری نہیں ہے تو پھر اس کو آیت مذکورہ کی تعبیر و تفسیر میں پیش کیا جا سکتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ ایسا اجماع تو کوئی پیش نہیں کر سکتا۔ دور صحابہؓ کے پاکیزہ معاشرے میں چہرے کے پردے کے بغیر سامنے آنے کی مثالیں تلاش کرنا اور ان کو دور حاضر میں بھی چہرے کا پردہ نہ کرنے کے لیے بطور دلیل پیش کرنا' آخر تحقیق کی کون سی قسم ہے؟ جبکہ ہمارے معاشرے میں بے حیائی' عریانی اور فحاشی کا ایک تباہ کن سیلاب آیا ہوا ہے اور یہ مادیت' نفسانیت اور حیوانیت کے غلبے کا دور ہے۔ صحابہؓ و صحابیاتؓ کا عمل بھی ہمارے لیے نمونہ ہے لیکن قرآن کے واضح حکم کے مقابلے میں ان کا عمل حجت نہیں بن سکتا۔

فقہاے اسلام میں جن ائمہ کی رائے یہ ہے کہ غیر محرم مردوں کے سامنے چہرے کو کھولنا جائز ہے' انھوں نے اس اجازت کو اس شرط کے ساتھ مشروط کر دیا ہے کہ اس سے فتنے کا خطرہ نہ ہو لیکن آج کل تو ہمارا معاشرہ فتنوں کے طوفان میں گھرا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان ائمہ کے متبعین و معتقدین کے نزدیک بھی آج کے پرفتن دور میں چہرے کا پردہ ضروری ہے (درمختار بمعہ رد المحتار باب شروط الصلوٰۃ' ج ا' ص ۳۷۷' اور الحظر والاباحۃ ج ۵' ص ۳۲۵)۔ اس کی وجہ "سد ذریعہ" کا قانون ہے کہ کوئی جائز کام بلکہ مستحب کام بھی جب خرابی کا ذریعہ بنتا ہو تو اس پر پابندی لگائی جا سکتی ہے جبکہ خطرہ شدید ہو' صرف وہم پر مبنی نہ ہو۔

غیر محرم رشتے داروں سے پردہ اور مشترک گھر

(۲) دوسرا مسئلہ غیر محرم اقارب سے پردہ کرنے کا ہے لیکن اس کا تعلق اس سوال سے ہے کہ کیا علیحدہ گھر عورت کا شرعی حق ہے؟ اس کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے: اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ

وُجْدِكُمْ وَلَا تُضَارُّوهُنَّ لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ...... لِيُنْفِقْ ذُوسَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهِ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتٰهُ اللّٰهُ۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَا اٰتٰهَا - سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا (الطلاق ۶۵: ۶-۷) "ان کو رہنے کے لئے گھر دو جہاں تم خود رہتے ہو، اپنی مالی حیثیت کے مطابق اور ان کو ایذا نہ پہنچاؤ تاکہ تم ان پر تنگی کرو..... رزق کی فراخی والا شخص فراخی کے ساتھ خرچ کرے اور جس پر اس کا رزق تنگ کر دیا گیا ہو تو وہ اتنا خرچ کرے جتنا اس کو اللہ نے دیا ہے۔ اللہ کسی پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اسی چیز کا جو اس نے اس کو دی ہو۔ ابھی دے دے گا اللہ سختی کے بعد آسانی اور فراخی"۔ یہ آیات اگرچہ طلاق کی عدت گزارنے والی عورتوں کے بارے میں ہیں لیکن یہ منکوحہ عورتوں پر بطریق اولیٰ صادق آتی ہیں۔ ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ بیوی کے روٹی، کپڑے اور مکان کی ذمہ داری شوہر پر عائد ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اس کو مال کی فراخی اور فراوانی دی ہو تو بیوی بچوں کو مکان اور نفقہ بھی اپنی حیثیت کے مطابق دے گا اور اگر اللہ تعالیٰ نے اسے رزق کی تنگی اور مال کی کمی کے امتحان میں ڈال دیا ہو تو اللہ نے جو دیا ہے اس کے مطابق خرچ کرے۔ اس آیت اور اس مسئلے پر دوسری نصوص کی روشنی میں فقہ حنفی کی معروف کتاب: الھدایہ میں تصریح کی گئی ہے: "شوہر پر لازم ہے کہ بیوی کو رہنے کے لیے علیحدہ گھر فراہم کرے جس میں اس کے رشتے داروں میں سے اور کوئی نہ رہتا ہو الا یہ کہ بیوی ان کے ساتھ رہنے پر راضی ہو۔ اس لیے کہ بیوی کو مکان کی اسی طرح ضرورت ہوتی ہے جس طرح کہ نفقے کی ضرورت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے خرچے کے ساتھ گھر کو بھی اس کا حق قرار دیا ہے۔ جب یہ اس کا حق ہے تو شوہر کے لیے جائز نہیں ہے کہ کسی اور کو بھی اس گھر میں اپنی بیوی کے ساتھ رہنے کی اجازت دے۔ اس لیے کہ اس کو تکلیف پہنچے گی، اس کا سامان محفوظ نہیں رہے گا، وہ اپنے شوہر کے ساتھ آزادانہ اور بے تکلفانہ زندگی نہیں گزار سکے گی (حسن معاشرت) اور میاں بیوی دونوں ازدواجی تعلقات (استمتاع) بھی قائم نہیں کر سکیں گے۔ اگر بیوی مشترک گھر میں رہنے پر راضی ہو جائے اور اپنے حق سے دست بردار ہو جائے تو اس کا علیحدہ گھر کا حق ساقط ہو جائے گا۔ اگر شوہر کا دوسری بیوی سے بیٹا ہو تو اس کو بھی بیوی کے گھر میں ٹھہرانے کی اجازت نہیں ہے۔ البتہ اگر شوہر نے بیوی کو ایک بڑے مکان کے الگ کمرے میں ٹھہرایا ہو جس کا تالہ اور چابی الگ ہو تو یہ بھی کافی ہے، اس لیے کہ ضرورت پوری ہو گئی" (ھدایہ بمعہ فتح القدیر، کتاب النکاح، باب النفقہ، فصل فی السکنیٰ، ج ۴، ص ۳۹۷۔ فقہ شافعیؒ، فقہ حنبلیؒ اور فقہ مالکیؒ میں بھی یہی حکم ہے۔ ملاحظہ کیجیے الموسوعۃ الفقہیہ الکویتیہ ج ۲۵، ص ۱۰۸-۱۰۹ مادہ السکنیٰ)۔

باقی رہی شوہر کے والدین کی خدمت تو حسن معاشرت اور اخلاق حسنہ کا تقاضا ہے کہ میاں بیوی دونوں ایک دوسرے کے والدین کا احترام کریں، ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں اور ان کی خدمت بھی کریں۔ بڑوں

کی تعظیم و توقیر ویسے بھی اسلامی معاشرے کے آداب میں شامل ہے۔ لیکن قانوناً تو بیوی پر اپنے شوہر کے لیے کھانا تیار کرنا، کپڑے دھونا اور گھر کی صفائی کرنا بھی لازم نہیں ہے تو شوہر کے والدین کی خدمت کرنے پر اسے کیسے مجبور کیا جا سکتا ہے؟ حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کا مسلک یہی ہے کہ بیوی کو گھر کے کام کرنے پر قانوناً و قضاءً مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ مالکیہ کا مسلک یہ ہے کہ حسب استطاعت بیوی کے لیے ضروری ہے کہ کھانا پکانے، کپڑے دھونے، صفائی کرنے اور دوسرے گھریلو کام کرنے کا بوجھ اٹھائے، اگر اس کے علاقے کا رسم و رواج اور عرف عام یہی ہو، اس لیے کہ یہ "معاشرت بالمعروف" کا تقاضا ہے۔ اس کے علاوہ صحابیاتؓ اور تابعیاتؒ اپنے شوہروں کے گھر کے کام کیا کرتی تھیں بلکہ بعض تو بیرون خانہ کاموں میں بھی ان کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ لیکن جمہور کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ حسن اخلاق اور حسن معاشرت کا تقاضا تھا، کوئی شرعی پابندی نہیں تھی بلکہ جمہور فقہا کے نزدیک تو بیوی کے اپنے کام کرنے کے لیے خادم کا خرچہ برداشت کرنا بھی شوہر پر لازم ہے اگر وہ اس کی استطاعت رکھتا ہو اور بیوی کو خدمت کے لیے خادم کی ضرورت ہو۔ (فتاویٰ قاضی خان برحاشیہ عالمگیری، ج ۱، ص ۴۴۳، فتح القدیر ج ۴، ص ۳۸۷، الموسوعۃ ص ۲۴-۵۹، مادہ زوج)۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ مکان ملکیتی ہو بلکہ کرائے کا مکان یا عارضتاً لیا گیا مکان بھی کافی ہے۔ بیوی کے نفقہ اور سکنیٰ اور زوجین کے حقوق و فرائض سے متعلق اور بھی احکام و آداب فقہ کی کتابوں میں بیان ہوئے ہیں لیکن وہ اس وقت موضوع سے باہر ہیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ غیر محرم رشتے داروں سے پردے کی حدود کیا ہیں؟ اور کیا کوئی غیر محرم رشتے دار زنانہ مکان میں داخل ہو سکتا ہے؟ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ سورہ نور کی آیت نمبر ۳۱ میں جن گیارہ افراد کا ذکر ہوا ہے ان کے علاوہ کسی اور کے سامنے عورت اپنی آرائش و زیبائش اور بناؤ سنگھار کا اظہار نہیں کر سکتی خواہ وہ بالکل اجنبی ہو یا غیر محرم رشتے دار ہو۔ اس آیت میں اگرچہ چچا اور ماموں کا ذکر نہیں کیا گیا لیکن یہ دونوں آباء میں شامل ہیں۔ اسی طرح رضاعی اقارب کا ذکر بھی آیت میں نہیں ہوا لیکن بخاری و مسلم کی متفق علیہ حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رضاعی محارم کا حکم وہی ہے جو نسبی محارم کا ہے۔ بہرحال محارم کے علاوہ دوسرے اعزہ و اقارب اور اجانب دونوں قسم کے مردوں کے سامنے زیب و زینت کی نمائش جائز نہیں ہے خواہ گھر کے اندر ہو یا گھر کے باہر۔

دوسری پابندی یہ ہے کہ شوہر کی پسند اور اجازت کے بغیر بیوی کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ ابوہریرہؓ کی ایک حدیث میں فرمان نبویؐ نقل ہوا ہے کہ: ولا تاذن فی بیتہ الا باذنہ (بخاری، کتاب النکاح)، شوہر کی اجازت کے بغیر بیوی کسی کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہ دے۔ جابر بن عبداللہؓ کی ایک طویل حدیثؓ میں آیا ہے کہ: فلا یوطئن فرشکم من تکرھون ولا یاذن فی بیوتکم لمن تکرھون (ترمذی کتاب التفسیر سورہ توبہ، ونحوہ فی مسلم حجتہ الوداع)، "تمہاری بیویاں تمہارے بستروں پر ان کو نہ بٹھائیں

جن کو تم پسند نہ کرتے ہو۔ اور تمھارے گھروں میں ان کو داخل ہونے کی اجازت نہ دیں جن کو تم پسند نہ کرتے ہو"۔ ان احادیث کا صحیح مفہوم امام نوویؒ نے اس طرح بیان کیا ہے: "بیوی کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ کسی کو اپنے شوہر کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت دے سوائے اس کے جس کے بارے میں وہ جانتی ہو کہ میرا شوہر اس کے اندر آنے کو ناپسند نہیں کرتا اور وہ اس کے آنے پر ناراض نہیں ہے۔ خواہ اندرونِ خانہ آنے والا مرد ہو یا عورت اور محرم ہو یا غیر محرم" (نووی شرح مسلم حجتہ الوداع)۔

اس حدیث اور اس کی مذکورہ تشریح سے معلوم ہوا کہ شوہر کی پسند اور اجازت کے بغیر محرم مرد اور عورت کو بھی گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جا سکتی اس لیے کہ بعض محارم اور عورتیں بھی فتنے اور خرابی کا باعث بن سکتی ہیں۔ شوہر کی پسند اور اجازت سے غیر محرم اعزہ و اقارب بھی اندر آ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ بعض غیر محرم رشتے داروں کے ساتھ محارم سے بھی زیادہ تعلقات اور روابط ہوتے ہیں اور وہ محارم کی طرح قابل اعتماد ہوتے ہیں۔ اس لیے ایسے رشتے دار اگر گھر کے دوسرے افراد کی موجودگی میں خاتون خانہ سے ملیں، بات کریں اور خاتون بھی سر اور سینے پر دوپٹہ ڈال کر یعنی "بکل" مار کر اس سے خیر خیریت پوچھے، دعا سلام کرے اور ضروری بات چیت کرے تو اس کی اجازت مذکورہ حدیث سے اشارتاً ثابت ہوتی ہے۔ اس بارے میں مولانا مودودیؒ کی رائے صائب معلوم ہوتی ہے اور حدیث مذکور کے مفہوم کے مطابق نظر آتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں: "جن رشتے داروں سے ابدی حرمت کا رشتہ نہ ہو (یعنی جن سے ایک کنواری یا بیوہ عورت کا نکاح جائز ہو) وہ تو نہ محرم رشتے داروں کے حکم میں ہیں کہ عورتیں بے تکلفی کے ساتھ ان کے سامنے آئیں اور نہ بالکل اجنبیوں کی طرح ہیں کہ عورتیں ان سے ویسا ہی مکمل پردہ کریں جیسا غیروں سے کیا جاتا ہے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ٹھیک ٹھیک کیا رویہ ہونا چاہیے؟ یہ شریعت میں متعین نہیں کیا گیا کیونکہ اس کا تعین ہو نہیں سکتا۔ اس کے حدود مختلف رشتے داروں کے معاملے میں ان کے رشتے، ان کی عمر، عورت کی عمر، خاندانی تعلقات و روابط اور فریقین کے حالات (مثلاً مکان کا مشترک ہونا یا الگ الگ مکانوں میں رہنا) کے لحاظ سے لامحالہ مختلف ہوں گے اور ہونے چاہییں" (تفہیم القرآن، ج ۳، ص ۳۸۸)۔

اس سلسلے میں تیسری اہم بات یہ ہے کہ غیر محرم رشتے دار کے ساتھ خلوت اور علیحدگی میں ملنا اور بیٹھنا ممنوع ہے۔ احادیث میں اس کو دین و اخلاق کے لیے تباہ کن قرار دیا گیا ہے۔ اس بارے میں چند احادیث ملاحظہ کیجیے تاکہ اس حکم کی اہمیت معلوم ہو جائے۔

(۱) عقبہ بن عامرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "اجنبی عورتوں کے پاس جانے سے دور رہو (علیحدگی میں)۔ اس پر انصار کے ایک شخص نے کہا کہ شوہر کے بھائی اور اس کے

دوسرے رشتے داروں کے بارے میں بھی بتایئے! آپؐ نے فرمایا: شوہر کے بھائی اور رشتے داروں سے خلوت میں ملنا تو موت ہے یعنی زیادہ خطرناک ہے"۔ (بخاری، مسلم)

متن حدیث میں "الحمو" آیا ہے جس کی جمع ہے "احماء"۔ اس کا اطلاق اکثر تو شوہر کے بھائی پر ہوتا ہے لیکن امام نوویؒ نے مسلم کی شرح میں لکھا ہے: "احماء شوہر کے اقارب کو کہتے ہیں مگر اس حدیث میں شوہر کا بھائی، اس کا بھتیجا، بھانجا، چچا، چچازاد بھائی اور اس قسم کے وہ اقارب مراد ہیں جن کے ساتھ اس عورت کا نکاح جائز ہو، اگر وہ بیوہ ہو جائے۔ لوگ اس بارے میں چونکہ عام طور پر تساہل اور غفلت سے کام لیتے ہیں اس لیے ان کے ساتھ خلوت کو موت سے تشبیہ دے کر رسول اللہؐ نے اس کے ممکنہ خطرات سے آگاہ فرمایا ہے"۔

(۲) جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عورت کے پاس کوئی رات نہ گزارے مگر اس کا شوہر اور اس کا محرم" (مسلم)۔

(۳) جابرؓ سے مروی ہے: "ان عورتوں کے گھروں میں نہ جاؤ جن کے شوہر موجود نہ ہوں اس لیے کہ شیطان خون کی طرح تمہارے جسم میں گردش کرتا ہے" (ترمذی فی الرضاع)۔

(۴) حضرت عمرؓ سے مروی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کوئی بھی غیر محرم عورت کے ساتھ خلوت اور علیحدگی میں نہ ملے اس لیے کہ اس صورت میں ان دونوں کے ساتھ شیطان تیسرا ہوتا ہے" ((ترمذی فی الفتن)۔

(۵) ابن عباسؓ سے مروی ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ خلوت میں ہرگز نہ ملے، مگر محرم کی موجودگی میں" (بخاری فی النکاح)۔

ان احادیث کی بنا پر فقہائے اسلام کا اتفاق ہے کہ غیر محرم عورت کے ساتھ علیحدگی میں ملنا اور بیٹھنا حرام ہے، اس لیے کہ اس سے شیطانی خیالات آنے اور غیر اخلاقی افعال میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہے۔ لیکن حدیث نمبر پانچ سے ثابت ہے کہ اگر عورت کے پاس اس کا محرم یا شوہر موجود ہو تو اس صورت میں ملنا جائز ہے۔ اس لیے کہ یہ "خلوت" نہیں ہے اور اس سے کوئی خاص خطرہ بھی نہیں ہے۔ اسی طرح اگر مجلس میں دوسری عورت موجود ہو یا کئی عورتیں موجود ہوں یا مرد اور عورتیں دونوں موجود ہوں تو اس صورت میں ملنا جائز ہے۔ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں: "خلوت کی حرمت اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب کہ درمیان میں پردہ ہو یا محرم موجود ہو یا کوئی قابل اعتماد ثقہ عورت موجود ہو" (ردالمحتار ج ۵، ص ۲۳۶، شافعیہؒ کا قول اصح یہی ہے المجموع شرح المہذب ج ۷، ص ۱۱-۱۲)۔

عورتوں کے برسرِ عام مظاہرے کرنا

(۳) تیسرا مسئلہ جس کا ذکر سوال نامے میں کیا گیا ہے، وہ ہے عورتوں کا کھلے عام بازاروں اور سڑکوں پر مظاہرہ کرنا۔ اس بارے میں میری سوچ اور حاصل مطالعہ یہ ہے کہ خواتین کے باپردہ اجتماعات، ان کا مجالس وعظ و تربیت میں باپردہ شرکت کرنا اور ان کی تعلیم کا اہتمام کرنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ افادیت رکھتا ہے، لیکن مخلوط اجتماعات، مخلوط تعلیم اور برسرِعام مظاہرے کرنا اور ریلیاں منانا، عورتوں کے دائرہ کار اور طریق کار سے تجاوز کرنا ہے۔ شریعت نے مردوں اور عورتوں کے لیے جو تقسیم کار کی ہے، یہ اس کے مطابق نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے جلوسوں اور مظاہروں میں بے پردہ خواتین بھی گھس جاتی ہیں اور باپردہ خواتین کے لیے بھی ایسے مواقع پر حجاب و نقاب کی پابندی مشکل ہو جاتی ہے۔ ایسے مظاہروں میں اکثر نعرہ بازی بھی ہوتی ہے اور بغیر ضرورت و حاجت کے خواتین کی آواز سننا سنانا بھی شرعی آداب کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت کی اذان مکروہ ہے اور نماز کے دوران اگر امام کو اس کی غلطی پر متوجہ کرنے کی ضرورت پیش آئے تو مرد سبحان اللہ کہیں گے مگر عورتوں کو سبحان اللہ کہنے کی اجازت نہیں ہے بلکہ وہ تالی بجا کر توجہ دلائیں گی۔ کفار کے مقابلے میں قتال کرنا کتنی بڑی عبادت ہے اور کتنا بڑا جہاد ہے، اس سے ہر مسلمان واقف ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور خلفاے راشدینؓ نے عورتوں کو میدان جنگ میں حاضر ہونے کا نہ حکم دیا ہے، نہ ترغیب دلائی ہے اور نہ عورتوں کو محاذ جنگ میں لے جانے کا اہتمام کیا ہے۔ عورتوں کا شوق تھا کہ ہم بھی جہاد میں شرکت کرنا چاہتی ہیں لیکن آپؐ نے فرمایا کہ تمہارا حج پر جانا، شوہر کے گھر اور بچوں کی نگرانی کرنا اور اپنے دائرہ کار میں رہ کر دوسرے دینی کام کرنا جہاد ہے۔ البتہ ہنگامی حالات میں صحابیاتؓ محاذ جنگ میں شریک ہوئی ہیں اور مجاہدین کو پانی پلانے، ان کا علاج کرنے اور ان کی لاشیں اٹھانے کی خدمات انجام دی ہیں۔ خواتین نفیر عام کے وقت جنگ میں عملاً حصہ لے سکتی ہیں بلکہ ایسے مواقع پر ان پر بھی جہاد فرض ہو جاتا ہے لیکن کھلے عام مظاہرے کرنے کی نہ شرعی ضرورت ہے اور نہ عورتیں اس کی مکلف ہیں۔

ڈاکٹر انیس احمد

حجاب اور خواتین کے دعوتی کردار کے حوالے سے سوالات و مباحث اس بات کا پتا دیتے ہیں کہ جہاں تحریک اسلامی سے وابستہ حلقوں میں دعوت دینے کی تڑپ نہ صرف موجود ہے بلکہ اس میں اضافہ ہو رہا ہے وہاں یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ الحمدللہ اس فریضے کی ادائیگی میں مسلمان خواتین اسلامی حدود میں رہتے ہوئے ہی اس فریضے کو ادا کرنا چاہتی ہیں۔ ان کے لیے ضروری ہے کہ دامن اعتدال کو ہاتھ سے نہ چھوڑیں، ایک

ایسے دور میں جب مکمل طور پر مغرب کی پیروی یا بلاامتیاز ہر مغربی ذریعے کا رد، امت مسلمہ کو دو ایسے دھڑوں میں تقسیم کرنے کی طرف لے جارہا ہے جس میں غلو اور عدم عدل ہو۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ قرآن و حدیث کے ناقابل تغیر اصولوں کی روشنی میں ہر معاملے کا جائزہ لیں۔

نومبر ۹۶ کے ترجمان القرآن میں محترم خرم مرادؒ نے وضاحت کر دی تھی کہ کسی مسئلے پر اطمینان قلب تو اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے پیدا ہو سکتا ہے لیکن جن عملی مسائل کی طرف آپ نے دوبارہ متوجہ کیا ہے وہ اہم بھی ہیں، اجتہادی بھی اور اسلامی معاشرے کی تعمیرو تشکیل کے لیے ان پر غور ہم ہی پر فرض ہے۔

آپ کے گیارہ follow up سوالات میں سے ہر ایک کا علیحدہ جواب ترجمان القرآن کے صفحات کی محدودیت کی بنا پر ممکن نہیں لیکن ان تمام سوالات کو تین موضوعات کے تحت لایا جا سکتا ہے، اولاً چہرے کے پردے سے متعلق قرآن و حدیث کے احکام، ثانیاً" اسلامی خاندانی نظام یا ایک شوہر اور بیوی کا وسیع خاندان میں ذاتی آزادی (privacy) کا حق اور ثالثاً" عائلی ذمہ داریوں کے ساتھ دعوت اور امربالمعروف کے فریضے کی ادائیگی۔ ذیل میں اس سلسلے میں چند گزارشات کی جارہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی ان معاملات میں ہمیں اپنے دلوں کو یکسو کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ حجاب کے حوالے سے محترم مولانا مودودیؒ" مولانا امین احسن اصلاحی، استاذ البہی الخولی، سید جلال الدین عمری، شیخ یوسف القرضاوی وغیرہ کی علمی و تحقیقی تحریرات میں حجاب اور متعلقہ موضوعات پر سیر حاصل گفتگو موجود ہے۔ یہاں انتہائی اختصار سے اسلامی اصول اور ان کی تطبیق کا ذکر کیا جائے گا۔

اسلام ستر عورۃ اور حجاب خصوصاً چہرے کے حجاب میں فرق کرتا ہے۔ ستر عورۃ سے مراد جسم کے وہ حصے ہیں جن کا ایک شوہر یا بیوی کا اپنے زوج کے علاوہ کسی اور کے سامنے کھولنا ممنوع اور حرام ہے۔ خواتین کے لیے ستر عورۃ کی حدود ام المومنین عائشہؓ کی اس حدیث نے متعین فرمادیں ہیں جس میں حضور نبی کریمؐ نے انھیں مخاطب فرماتے ہوئے اپنے دست مبارک سے اشارہ فرمایا کہ جب ایک لڑکی بالغ ہو جائے تو اس کے چہرے اور ہاتھ کے علاوہ تمام جسم ستر عورۃ میں شامل ہے۔ اسی طرح حضورؐ نے مرد کے لیے ناف سے گھٹنے تک کے حصے کو ستر عورۃ قرار دیا۔ جس معاملے میں قرآن یا سنت سے ایک متعین اور واضح حکم موجود ہو اس پر اجتہاد نہیں ہو سکتا لیکن جب کسی معاملے میں نصوص کی تعبیر و تاویل ایک سے زائد ہو سکتی ہو تو تعبیر و تاویل کی حیثیت اجتہاد کی ہو جائے گی اور کسی ایک تعبیر پر اصرار کرنا دین میں دقت اور عسر پیدا کرنے کی طرف لے جائے گا جب کہ یسر، دین کا ایک بنیادی اصول ہے۔

چہرے کے حجاب کا معاملہ بھی اس نوعیت کے معاملات میں آتا ہے اور اجتہادی ہے۔ ستر عورۃ کے حوالے سے قرآنی آیات اور احادیث کی کوئی تعبیر نہیں کی جا سکتی ہے۔ اس پر سنی مکاتب فکر اور شیعہ فقہ

میں کوئی اختلاف ہمارے علم میں نہیں ہے۔ ہاں' آیت حجاب' کیا امہات المومنین کے لیے مخصوص ہے یا اس میں عموم ہے' اس پر مفسرین و فقہا میں اختلاف پایا جاتا ہے اور اس بنا پر یہ مسئلہ اختلافی بن جاتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ اگر شارع کا مدعا اس معاملے میں کسی اختلاف کی گنجایش کو ختم کر دینا تھا تو نزول وحی کے دوران اللہ تعالیٰ کو اس بات سے کوئی قوت روکنے والی نہیں تھی کہ صرف ایک مفہوم کو متعین کر دیا جاتا۔ قرآن کی کسی آیت کا ایسی شکل میں نازل ہونا جس کی تعبیر ایک سے زائد کی جاسکے بالواسطہ طور پر اختلاف کی گنجایش فراہم کرتی ہے اور اصول یسر کی ایک شکل ہے۔

آپ کا فرمانا کہ جہاں نصوص موجود ہوں اختلاف نہیں کیا جا سکتا محل نظر ہے۔ قرآن اور حدیث کے واضح احکام (حکم شرعی)' مثلاً تحریم ربٰو (البقرہ ۲:۲۷۵-۲۷۸' آل عمران ۳:۱۳۰) نے یہ بات ہمیشہ کے لیے طے فرما دی کہ ربٰو حرام ہے لیکن کون سے معاملات ربٰو کی تعریف میں آئیں گے' یہ کام فقیہ اور ماہر علم کا ہے کہ وہ قرآن و حدیث کے منشا و مدعا کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا تعین کرے اور جب بھی یہ شکل پیش آئے گی---- یہ ایک انسانی معاملہ ہے---- اس میں ایک سے زائد آرا اور نتیجتاً اختلاف کا امکان رہے گا۔ اس لیے ہمارا یہ کہنا کہ چہرے کا حجاب ایک اختلافی مسئلہ ہے' دین سے انحراف یا دین میں جدیدیت قطعاً نہیں ہے۔ دور نبویؐ میں ہمیں ایسے واقعات ملتے ہیں جن میں صحابیات نے چہرے کا پردہ نہیں کیا۔ خود حضرت عمرؓ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو متوجہ فرمانا کہ آپؐ امہات المومنین کو حجاب کا مشورہ دیں اس بات کی دلیل ہے کہ اس وقت تک امہات المومنین بھی چہرے کا حجاب نہیں کرتی تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اولین اور آخری حج کے سلسلے میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں جو احادیث موجود ہیں ان پر نظر ڈالیے تو وہ تفصیلات موجود ہیں جن کے مطابق حضرت عائشہؓ اور دیگر امہات المومنین صرف اس وقت جب قافلے ان کے پاس سے گزرتے تھے اپنے چہرے موڑ لیتی تھیں یا ڈھانپ لیتی تھیں۔ اس لیے یہ مسئلہ بہرصورت اختلافی ہے اور اس میں کسی ایک فریق کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسروں کو اپنی رائے پر مجبور کرے۔

آپ نے اس سلسلے میں کتب کے حوالے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ مجھے علم نہیں خرم بھائی کا اشارہ کن کتب کی طرف تھا لیکن میرے ذاتی کتب خانے میں چار جلدوں پر محیط ایک کتاب المراۃ فی عصر الرسالۃ: دراسۃ جامعۃ لنصوص القرآن الکریم و صحیحی البخاری ومسلم (دار القلم للنشر والتوزیع' الکویت' ۱۹۹۰ء / ۱۴۱۰ھ) موجود ہے جو ۱۳۴۵ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی آخری اور پانچویں جلد بھی غالباً طبع ہو گئی ہے جو میرے پاس نہیں ہے۔ ان چار جلدوں میں وہ تمام قرآنی آیات و احادیث بڑی محنت سے جمع کر دی گئی ہیں جن کا ذکر خاص طور پر حجاب کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ ان میں پہلی جلد میں صفحات ۱۰۲ تا

میں آئے گا یا عموم سمجھا جائے گا' اس پر کوئی رائے صرف قرآن وحدیث کے مدعا و مقصد کو سامنے رکھ کر ہی قائم کی جاسکتی ہے اور ایسی ہر رائے قیاسی ہوگی جس میں مزید تبدیلی واختیار کی گنجایش ہمیشہ رہے گی۔

یہاں اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا آیت حجاب نے غض بصر کے حکم کو منسوخ کر دیا۔ کیونکہ غض بصر بظاہر اس شکل ہی میں ہو سکتا ہے جب چہرے کا حجاب نہ ہو۔ اگر سر سے پاؤں تک تمام جسم مکمل طور پر ڈھانپا ہوا ہو تو غض بصر کی منطق؟ بات صرف غض بصر کی نہیں قرآن پاک نے غض صوت کا حکم بھی دیا ہے اور دونوں کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے اگر گفتگو کی ضرورت پیش آئے تو کون سا رویہ اخلاقی ہے۔ اور ایسے میں اگر ایک خاتون کو گھر سے باہر نکلنا ہو یا افراد معاشرہ سے رابطہ کرنا ہو تو اس کی حدود کیا ہیں۔

۳۔ اس بات کا تعلق کہ کیا چہرے کو کھول کر ہی خاندانی رشتوں اور روابط کو جوڑا جا سکتا ہے' دراصل رشتوں کی نوعیت پر منحصر ہے' مثلاً اگر ایک بھتیجی یا بھانجی اپنے سگے ماموں یا چچا کے سامنے سر سے پاؤں تک حجاب میں آتی ہے تو کیا یہ ایک فطری عمل ہے؟ کیا شریعت کا مقصود یہ ہے؟ کیا حرام و حلال رشتوں میں حجاب کی یہی شکل شریعت چاہتی ہے؟ یہ طے کرنے کے لیے ہمیں یہ اور دیگر سوالات عقلی طور پر زیر بحث لانے ہوں گے کیونکہ شریعت کوئی کام فطرت اور عقل کے منافی نہیں کرنا چاہتی۔ عقل کا حفظ شریعت کے مقاصد میں سے ایک مقصد ہے اس لیے اس کا انحصار رشتوں کی نوعیت پر ہے۔ بعض صورتوں میں چہرے کا مکمل حجاب رشتوں کو جوڑنے کا سبب نہیں بنے گا اور الا ما ظهر کی صحیح تعبیر میں بھی نہیں آئے گا۔ ایک سگے چچا یا ماموں کا ردعمل اپنی بھتیجی یا بھانجی کے ہشاش بشاش چہرے کو دیکھ کر اس سے بہت مختلف ہوگا جو ایک سگے چچا زاد یا خالہ زاد بھائی کا ہو سکتا ہے۔ گویا رشتے کی نوعیت یہ طے کرے گی کہ چہرے کا حجاب اصول اسلام کی پیروی میں مد و معاون ہے یا رکاوٹ ہے۔

میرے خیال میں دینی حلقوں میں چہرے کے حجاب کے مسئلے کو بنیادی اہمیت دینا اور صرف اس بنا پر کسی کے تقویٰ کی پیمایش کرنا دین کی حکمت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ یہی وہ طرز عمل ہے جو ہمیں غلو کی طرف لے جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات ہم ان معاملات میں باریک بینی اور دقت نظر کی وجہ سے زیادہ اہم معاملات کو نظر سے اوجھل کر دیتے ہیں اور بنی اسرائیل کی طرح سوئی کے برابر معاملے میں حساس اور اونٹ جیسے بڑے بڑے معاملات میں درگذر کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس افراط و تفریط اور عدم توازن سے محفوظ رکھے۔

۴۔ امر بالمعروف اور دعوت دین میں بعض اوقات پردہ ایک رکاوٹ بھی ہو سکتا ہے' اور مددگار بھی۔ اس کا انحصار بڑی حد تک وقت اور حالات کی نوعیت پر ہوگا' مثلاً عیسائی یا غیر مسلم خواتین کے ایک سیمینار یا

کانفرنس میں چہرے کا مکمل حجاب کرنے کے بعد ایک تحریکی کارکن کا تقریر کرنا یا مقالہ پیش کرنا ابلاغ کے اس اصول کے منافی ہوگا جس کی تعلیم حدیث میں دی گئی ہے کہ حضور نبی کریمؐ اپنی محفل میں صحابہ سے اس طرح مخاطب ہوتے تھے کہ ہر صحابی یوں سمجھتا گویا آپؐ کی توجہ اس پر ہے۔ صرف خواتین کی نشست میں خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں، چہرے کے حجاب کے ساتھ خطاب کرنا عموماً ایک communication gap پیدا کرے گا۔ اس طرح دعوت اپنا اثر کھو سکتی ہے۔ لیکن ایک اسلامی تنظیم کے مشترکہ اجتماع میں ایک ماہر فن مسلمہ کا اپنے تخصص کے حوالے سے مقالہ پیش کرنا یا تقریر کرنا جب کہ چہرے کا حجاب بھی ہو، کم تر رکاوٹ ہوگا۔ نیز پردے کے پیچھے سے خطاب بھی مفید ہو سکتا ہے۔

۵۔ میرے خیال میں خط یا فون کے ذریعے غیر محرموں کو دعوت دینے اور براہ راست دعوتی گفتگو کرنے میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ بعض اوقات بلکہ اکثر اوقات ایک آواز چہرے سے زیادہ پر اثر اور پر کشش ہو سکتی ہے۔ ایسے ہی خط کے ذریعے اظہار اسی وقت موثر ہو سکتا ہے جب صاحب قلم کی پوری شخصیت خط میں ظاہر ہو جائے۔ میرے خیال میں ان معاملات میں کوئی دو ٹوک فیصلہ نہیں کیا جا سکتا اور اگر ایسا کیا جائے گا تو یہ مسئلے کا حل نہیں ہوگا بلکہ مسئلے کو مزید الجھانے یا مسئلے سے بچنے کا ایک طریقہ ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں تحریکات اسلامی کو اس نوعیت کے مسائل سے اپنا دامن بچانے کی جگہ ان پر اپنا موقف واضح کرنا ہوگا اور اس پر مسلسل نظر ثانی کرنی ہوگی۔ زندہ تحریکیں کبھی بھی اپنی ہی تدبیروں اور حکمت پر مبنی پالیسیوں کی دائمی اسیر نہیں ہو سکتیں۔ وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے نیز وقت اور موقع کی مناسبت سے ہر وقت اپنا ذہن کھلا رکھتی ہیں اور قرآن و حدیث کے ناقابل تغیر احکام کی تعبیر و تنفیذ حالات کی روشنی میں کرتی رہتی ہیں۔

دراصل قرآن و حدیث ایک مومن اور مومنہ میں وہ طرز عمل اور طرز فکر پیدا کرنا چاہتے ہیں جس کے بعد بے شمار معاملات کے لیے وہ حدیث کے الفاظ میں "دل کے مفتی" سے ہر لمحہ فتویٰ لے سکیں۔ خشیت قلب، حلال کی طلب، حرام سے اجتناب، مسئولیت اور احتساب کی کیفیت کا مسلسل طاری رہنا وہ کیفیت پیدا کرتا ہے کہ معاملہ خط لکھنے کا ہو یا پارلیمنٹ کے سامنے مظاہرہ کرنے کا ہو اس کا قلب بلا جھجک اسے بتا دیتا ہے کہ کیا کرنا چاہیے۔ بخاری اور مسلم میں ایک حدیث اس سلسلے میں خاص غور کی مستحق ہے۔ حضور نبی کریمؐ نے ایک موقع پر حضرت اسماءؓ بنت ابوبکر کو راستے میں اپنے اونٹ پر اپنے پیچھے بیٹھنے کی پیش کش کی۔ غور کیجیے اگر یہ پیش کش ہم میں سے کسی کو کی جاتی تو ہمارا رد عمل کیا ہوتا۔ پیش کش کرنے والی ہستی نبیؐ کی ہے کسی عام انسان کی نہیں اور پیش کش جسے کی جا رہی ہے وہ آپؐ کی سالی ہیں۔ لیکن حضرت اسماءؓ کے دل نے انھیں فتویٰ دیا کہ وہ ایسا نہ کریں، وہ ہچکچائیں اور حضورؐ نے ان کی ہچکچاہٹ دیکھ کر نہ برا مانا نہ اصرار

کیا کہ آپؐ کے اشارے یا حکم پر عمل کیوں نہیں ہوا۔

ہمارا یہ سمجھنا بھی درست نہیں ہے کہ صرف ایک خاتون کا چہرہ ہی کسی مرد کے دل میں کوئی خیالات پیدا کر سکتا ہے۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے امہات المومنین کو یہ حکم دیا کہ جب ان سے کوئی سوال کیا جائے تو پردے کے پیچھے سے اس کا مناسب جواب ایسے دیں کہ بات کرنے سے کوئی فتنہ نہ پیدا ہو۔ کیا اس پر قیاس کیا جائے کہ قرآن یہ چاہتا ہے کہ چہرے کی طرح آواز کا پردہ بھی کیا جائے؟ پھر آواز کے پردے پہ قدغن صرف خواتین پر لگانے کا جواز؟ اگر بنیاد صرف عقلی دلیل ہے کہ چہرہ جسم میں سب سے زیادہ جاذب ہے تو یہی بات آواز کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ یہی بات ایک خاتون کے ہاتھ کے بارے میں کی جا سکتی ہے کہ انگلیوں کی ساخت، رنگت اور حنا وغیرہ کی بنا پر وہ جاذب نظر ہو جاتا ہے۔ پھر اسے کیوں نہ ہروقت دستانے میں رکھا جائے۔

۶۔ رخصت و عزیمت کا معاملہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا ہم نے اسے عموماً سمجھ لیا ہے۔ جو دین عزیمت کو پسند کرتے ہوئے اعلیٰ اجر کا وعدہ کرتا ہے وہی دین اور اس کا لانے والاؐ اپنے عمل سے جو مثال پیش کرتا ہے اسے ام المومنین حضرت عائشہؓ نے اپنی ایک حدیث صحیح میں یوں ذکر فرمایا ہے کہ اگر آپؐ کے سامنے دو عمل ہوتے تو آپؐ اس میں سے آسان والے عمل کو پسند فرماتے اور اختیار فرماتے۔ اب ایک طرف داعی اعظمؐ کا اسوہ ہے کہ وہ آسانی کو اختیار فرماتے ہیں۔ قرآن کا حکم ہے کہ ہم نے دین کو تمھارے لیے آسان کر دیا ہے۔ دوسری طرف ہماری خواہش کہ ہم لازماً دین کو اپنے لیے مشکلات و آزمایشوں کا ذریعہ بنا کر چھوڑیں تو فیصلہ آپ خود فرمالیں کہ یہ غلو کی طرف جانے والا راستہ ہے یا توازن، وسط، قسط اور عدل والا راستہ۔ اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ مشتبہات سے نہ بچا جائے۔ نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ "آسانی" کے نام پر فرائض، سنت، نوافل، سب کو ایک ہی نوع شمار کر لیا جائے۔ نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان، تقویٰ اور احسان میں کوئی فرق نہ کیا جائے۔ لیکن دین کی صفت یسر کو عسر سے تبدیل کرنا عزیمت نہیں، ہمارے اپنے فہم کا قصور ہے۔

۷۔ اختلاف اور اختلافی مسائل کے حوالے سے یہ سمجھنا بھی درست نہیں کہ یہ بالعموم فقہا کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات انسانوں کی سہولت اور دین کی عالمگیریت کی بنا پر شارع خود احکام میں ایسی گنجایش رکھ دیتا ہے کہ جب ان پر غور کیا جائے تو تعبیر و مفہوم کے تعین میں ایک سے زیادہ امکانات ہوں۔ یہ صورت ان آیات کے بارے میں بھی ہے جنھیں ہم حکمی اور محکمات کہتے ہیں، مثلاً سرقہ کی سزا میں ہاتھ کاٹنا قرآن کا ایک غیر مبہم اور واضح حکم ہے لیکن ہاتھ کتنے نصاب پر کٹے گا، کس طرح کٹے گا، کہاں سے کٹے گا، کیا پہلے صرف انگوٹھا یا کلمہ شہادت والی انگلی کٹے گی، یہ کام کون کرے گا وغیرہ وہ سوالات ہیں جنھیں طے

کیے بغیر حکم کی تعمیل نہیں ہو سکتی اور ان سوالات میں سے اکثر کی تعبیر و تاویل ایک سے زائد پائی جاتی ہے۔ اسی طرح دیگر معاملات میں خواہ نکاح طلاق کے ہوں یا عبادات سے متعلق ہوں ایک سے زائد تعبیرات کی بنیاد خود حکم میں پائی جاتی ہیں۔ یہ فقیہہ یا عالم دین کی پیدا کردہ نہیں ہوتیں۔ بڑی واضح سی مثال سورہ مائدہ کی وہ آیت ہے جس میں وضو کا حکم دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اپنے سر سے مسح کرو۔ یہاں وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ متعین الفاظ ہیں جن کے معنی معروف ہیں لیکن امام ابوحنیفہؒ اس سے یہ مطلب لیتے ہیں کہ مسح تمام سر کا ہوگا جبکہ امام شافعیؒ اس کا مفہوم سر کے کسی حصے کے ساتھ مسح کرنے کو قرار دیتے ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دنیا کے تمام لغت کے ماہرین سے زیادہ اس بات کا علم تھا کہ ابو ادریس الشافعیؒ کس طرح اس آیت کی تعبیر کریں گے۔ اور اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر تھے کہ حکم ایسے الفاظ میں نازل فرمائیں کہ ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ پوری کوشش کے باوجود وہ تعبیریں نہ کر سکیں لیکن ایسا نہیں کیا گیا اور حکم ہی میں یہ گنجایش رکھ دی گئی۔ گویا نصوص قرآنی میں بجائے خود خلوص نیت کے ساتھ اختلاف رکھنے اور کرنے کی پوری گنجایش پائی جاتی ہے۔ اس لیے اس حجاب کی تعبیریں ایک سے زائد ہیں۔

۸۔ مشترکہ سیاسی اجتماع کے بارے میں آپ کے خدشات و خیالات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ مشترکہ سیاسی اجتماع سے اگر آپ کی مراد یہ ہے کہ ایک وسیع و عریض لیکچر ہال میں خواتین و مرد شانہ بشانہ بیٹھے ہوں اور چند خواتین نمایندوں کی حیثیت سے ان کے سامنے اپنے فن خطابت کا مظاہرہ کریں تو ہمیں حدیث شریف میں ایسی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ لیکن اگر اس سے مراد ایسی مجالس ہیں جہاں مردوں کی موجودگی میں خواتین اپنا نقطہ نظر' اپنے مسائل اور مشکلات پر اظہار خیال کریں یا مشورہ کریں تو نبی کریمؐ کی حیات مبارکہ میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ صحابہ کی محفل میں ایک صحابیہ تشریف لاتی ہیں اور اپنی مشکل پیش کرتی ہیں جس پر یا تو انھیں وہیں مناسب مشورہ دے دیا جاتا ہے یا انھیں ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ امہات المومنین سے اس کی تفصیل و عمل کی صورت سمجھ لیں۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے امہات المومنین کے حوالے سے خصوصاً اور ویسے عموماً یہ اصول طے کر دیا ہے کہ اگر ان سے کوئی سوال پوچھا جائے تو جواب دیتے وقت چند اخلاقی اصولوں کا خیال رکھیں۔ گویا وہ تمام امکانات جو مخالف جنس کے افراد سے بات کرتے وقت پیدا ہو سکتے ہیں' جن میں غیر ضروری طوالانی گفتگو' پرکشش اور سجھانے والا انداز' لطائف سے بھرپور آواز کے زیروبم کے ساتھ بات چیت شامل ہے' یہ کہہ کر کہ بات سادہ ہو' مختصر ہو اور دل میں فتنہ پیدا کرنے والی نہ ہو' ختم کر دیے گئے لیکن یہ نہیں کہا گیا کہ جنس مخالف کے سوال کا جواب نہ دیا جائے۔

اسلامی معاشرہ دراصل ایک اخلاقی معاشرہ ہے۔ اسے قانون کی بندشوں میں جکڑ کر وہ نتائج حاصل نہیں کیے جا سکتے جو معروف اور "بر" کو عام کر کے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اسی اصول کی روشنی میں ام المومنین

حضرت عائشہؓ نے اپنے حلقہ درس سے وہ سات فقہائے مدینہ پیدا کیے جو دین کے علم کو آگے پھیلانے کا ایک بڑا ذریعہ بنے۔ ان فقہا میں عبداللہ بن زبیرؓ اور سعید بن مسیبؒ جیسے صحابہ شامل ہیں۔ اسلام کا عمومی رجحان اہل ایمان کو ایک اخلاقی ضابطے کا پابند بناتا ہے۔ اسی لیے تنہائی (خلوت) یا ایسے مواقع کو کم سے کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن میں فتنہ پیدا ہو سکتا ہو اور غض بصر، ستر عورۃ اور لباس و گفتگو کے وہ آداب سکھائے گئے ہیں جن کے بعد ایک فرد حلال و حرام کی فکر، ذبیحہ اور مشروبات ہی میں نہ کرے بلکہ معیشت، سیاست، معاشرت، قانون، تعلیم، فنی علوم غرض ہر شعبہ حیات میں تحقیقی طور پر یہ دیکھے کہ کون سا عمل حلال ہے، مباح ہے، مکروہ ہے یا مندوب ہے۔

اسلامی شریعت نے اس بات کو بھی واضح کر دیا ہے کہ عملی معاملات میں اگر انتخاب ایک کم تر اور بر تر برائی ہی ہو تو کم تر کو یہ جانتے ہوئے اختیار کیا جا سکتا ہے کہ وہ بجائے خود حلال نہیں لیکن "ضرورت" اور حالات کی بنا پر جائز ہو گئی ہے۔ اگر یہ اصول اختیار نہ کیا جائے تو غلو سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ دین کے بنیادی اصولوں میں اجتہاد کا اصول اسی غرض کے لیے ہے کہ مقاصد شریعہ کی روشنی میں خلوص نیت کے ساتھ نئے مسائل کا حل تلاش کیا جائے اور موجود آرا میں سے راجح کا انتخاب کیا جائے۔

۹۔ مسلم خواتین کی دعوتی و تحریکی ذمہ داریوں اور کردار کے حوالے سے مولانا مودودیؒ اور دیگر علما کی تحریرات موجود ہیں۔ امربالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ان پر بھی ویسے ہی لازم ہے جیسے مردوں پر لیکن یہ کام ایک انسانی معاشرے کی ضروریات اور حالات کے پیش نظر ہی کیا جائے گا اور ایک فرد کو اپنے حالات اور دینی مصالح کی روشنی میں اپنی ترجیحات و اولیات کا فیصلہ کرنا ہو گا۔ امربالمعروف و نہی عن المنکر اور دعوت دین کا محل محض مسجد و مدرسہ نہیں ہے، یہ گھر، کھیت، فیکٹری، تعلیم گاہ، بازار، پارلیمنٹ ہر جگہ کرنی ہو گی اور حالات و ضروریات کے پیش نظر اجتہاد کا استعمال کرتے ہوئے کرنی ہو گی۔ میرے علم میں شریعت کا کوئی ایسا اصول نہیں ہے جس کی روشنی میں ایک فہرست ایسی مرتب کر لی جائے کہ پہلے شوہر اور بیوی یہ ذمہ داریاں ادا کریں گے اس کے بعد وہ امربالمعروف اور دعوتی کام کر سکتے ہیں۔ زندگی کے معاملات میں اس طرح کی مصنوعی سرحدیں قائم کرنا مسائل کا حل نہیں ہے۔ ہمیں کھلے ذہن کے ساتھ دعوتی سرگرمیوں کے سلسلے میں خواتین کے کردار کے دائرہ کار پر غور کرنا ہو گا اور اپنے رواج اور طرز عمل کو قرآن و حدیث کے تابع فرمان بنانا ہو گا۔ ظاہر ہے یہ کام تفصیل طلب ہے اور ایک اجتہادی عمل بھی ہے اور جہاد بھی۔ اور بجا طور پر اس میں صرف فرد متعلقہ کی رائے ہی نہیں بلکہ اس کے قریب ترین ساتھیوں اور بزرگوں کے مشورے کا بھی ایک اہم کردار ہے۔ ماں باپ، شوہر بیوی، بھائی بہن، اصحاب امر اور مامورین غرض سب کا حسب ضرورت مشورہ اور سب سے بڑھ کر آپ کے اپنے دل کا اطمینان اور رب کی خوشنودی کی طلب فیصلہ کن

حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۰۔ ایک اسلامی خاندانی نظام کی بنیاد ہی اس چیز پر ہے کہ خاندان کے ہر دو مخصوص آزادی کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے حقوق و فرائض کی ادائیگی کر سکیں جبکہ ہمارے ہاں رواجی طور پر یہ تصور کر لیا گیا ہے کہ ایک شادی شدہ جوڑے کی ضروریات وہی ہیں جو ایک غیر شادی شدہ فرد خاندان کی ہوتی ہیں۔ اس معاملے میں بھی جرات اور اجتہادی روح کے ساتھ سوچنے کی ضرورت ہے۔ لازمی طور پر ایک نئی شادی شدہ لڑکی کو اپنی زیبائش و آرائش ہی کی نہیں بلکہ اپنی پسند کے مطابق اور اپنے شوہر کی پسند کے مطابق بہت سے کام کرنے کی آسانی ہونی چاہیے۔ اس میں اس کے سسرال والوں کو حائل نہیں ہونا چاہیے لیکن ہمارے معاشرے میں معاشی اور ثقافتی رسم و رواج نے عموماً اس مسئلے کو بہت الجھا دیا ہے اور ہم دو انتہاؤں میں بٹے ہوئے ہیں، یا تو مکمل طور پر سسرال والوں سے علیحدگی اور تنہا nuclear خاندان کا رجحان یا مکمل طور پر روایات کے سامنے سپردگی اور ہر معاملے میں سسرال والوں کی پیروی۔ ان دونوں انتہاؤں سے نکل کر اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں آنے کے لیے ایک طویل تعلیمی مرحلے سے گزرنا ہو گا جس میں نوجوانوں اور بزرگوں دونوں کو کھلے ذہن کے ساتھ اپنے طرز عمل کا جائزہ لے کر افہام و تفہیم سے نیا نقشہ بنانا ہو گا۔

یاد رفتگان

مولانا خان محمد ربانیؒ

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں!

خورشید احمد

میں اپنی خالہ مرحومہ کی آخری رسومات سے فارغ ہو کر لیسٹر (انگلستان) واپس آیا ہی تھا کہ یکم ستمبر کو محترم قاضی حسین احمد صاحب کا ٹیلی فون آیا اور یہ روح فرسا اطلاع ملی کہ برادر محترم مولانا خان محمد ربانی راہی ملک عدم ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ایسے مواقع پر تعزیتی پیغام اور دعائے مغفرت کے سوا انسان کر بھی کیا سکتا ہے لیکن حقیقت ہے کہ دل پر بڑی ہی گہری چوٹ لگی اور میں صدمے سے نڈھال ہو گیا۔ جن بزرگوں اور ساتھیوں کی موت نے زندگی میں خلا کی کیفیت پیدا کی، ان میں تازہ ترین ضرب خان محمد ربانی صاحب کی جدائی ہے۔ محترم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور چودھری غلام محمد صاحب کا زخم تو ماہ و سال کی گردش سے بے نیاز ہر دم تازہ ہے۔ پھر برادرم خلیل حامدی اور خرم بھائی کی مفارقت نے زندگی میں نہ بھرنے والا خلا پیدا کر دیا ہے۔ اب اتنی جلدی خان محمد ربانی صاحب کے انتقال کی خبر دل پر ایک چوٹ بن کر لگی۔

ے کچھ ایسے بھی اس بزم سے اٹھ جائیں گے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

خان محمد ربانی صاحب تحریک اسلامی میں میرے بزرگوں میں سے تھے۔ ان سے پہلی ملاقات ۱۹۵۴ء میں، ملتان میں ہوئی جب میں جمعیت کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے وہاں دورے پر گیا اور جماعت اسلامی ملتان کے گل ہائے سرسبد، باقر خان، حسرت مرزا، بابو نصیر اور خان محمد ربانی رحمھم اللہ سے ملنے کا موقع ملا۔ یہ میری ان بزرگوں سے پہلی ملاقات تھی لیکن جس طرح وہ میرے ساتھ پیش آئے، اس سے ایسا لگتا تھا کہ ساری عمر ان ہی کے ساتھ گزری ہے۔ خصوصیت سے ربانی صاحب کی شفقت اور پیار کو میں کبھی نہیں بھول سکتا! پھر مرکزی شوریٰ اور دوسرے جماعتی پروگراموں کے ذریعے یہ سلسلۂ رفاقت چالیس سالوں پر پھیلا ہوا ہے۔

جس شفقت اور پیار سے وہ پہلے دن پیش آئے تھے آخری ملاقات تک ان کی کرم گستری کا وہی عالم رہا۔ سادگی، خلوص، نرمی، مٹھاس، بے ساختگی اور انکسار، یہ تھے وہ عناصر جن سے خان محمد ربانی صاحب کی شخصیت عبارت تھی اور مجھ سے ہی نہیں ان کا تو سب ہی سے کچھ ایسا معاملہ رہتا تھا۔

ربانی صاحب کو مجھے بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ ان نیک بندوں میں سے تھے جنھوں نے ایک بار اللہ کو اپنا رب تسلیم کر لیا اور پھر اس پر ساری زندگی قائم اور قانع رہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا کی چلتی پھرتی مثال، ان کی زندگی یک رنگی کا بے مثال نمونہ تھی۔ وہ جو اندر سے تھے وہی باہر سے تھے! قول و فعل میں یکسانی، گفتار و کردار میں ہم آہنگی اور پوری زندگی اللہ کی عبادت اور بندگی کے رنگ سے رنگین اور روشن۔ ان کو زندگی میں اگر کوئی چیز سب سے پیاری تھی تو وہ تھی: اللہ کے دین کے پیغام کو ہر انسان تک پہنچانے کی تڑپ! جب مولانا مودودیؒ کی پکار ان کے دل میں اتر گئی تو پھر انھوں نے اپنی قوت کی ہر رمق اور اپنے وقت کی ہر ساعت کو اس دعوت پر چلنے اور اس کی طرف اللہ کے بندوں کو بلانے کے لیے وقف کر دیا۔ میں نے ان کو دور از کار بحثوں، عقلی مکالموں اور قیل و قال سے بہت دور پایا۔ شوریٰ ہو یا ذاتی گفتگو، اپنی بات بڑی سادگی سے اور بڑے مختصر انداز میں پیش کرتے اور اس کا مقصد بس ایک ہوتا: ہمارے کرنے کا تو یہ کام ہے، آؤ بس اس کام میں لگ جائیں۔ انھوں نے میلوں پیدل چل کر، سخت ترین موسم میں سائیکل پر سفر کر کے اللہ کے بندوں تک اللہ کا پیغام پہنچایا۔ میں نے انھیں کبھی تحریکی لٹریچر کے بغیر نہیں دیکھا۔ آخری زمانے تک شوریٰ کے اجتماعات میں بھی ان کے پاس ایک کپڑے کی تھیلی ہوتی تھی جس میں لٹریچر ساتھ رکھتے تھے۔ ان کی گفتگو، ان کی تقریر، ان کا درس قرآن ہر چیز دعوتی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ بحث و مجادلہ کے نہیں عمل اور صرف عمل کرنے والے انسان تھے۔

ربانی صاحب کی زندگی سادگی اور قناعت کا نمونہ تھی۔ میں نے کبھی ان کو طلب دنیا اور زندگی کی آسایشوں کے بارے میں فکرمند نہیں دیکھا۔ جو کچھ اللہ نے دیا اس پر گذارہ کیا، جو قوت حاصل تھی اسے دعوت دین کے لیے وقف کیا۔ قرآن و حدیث اور اسلامی لٹریچر کا مطالعہ بڑی محنت اور وقت نظر سے کیا لیکن وہ بھی بس ایک متعین ہدف کو سامنے رکھ کر ---- یعنی خود اپنے کو ایک اچھا مسلمان کیسے بنائیں اور دین کی بنیادی دعوت دوسروں تک کیسے پہنچائیں۔ میں نے ان کو علمی بحثوں اور فلسفیانہ موشگافیوں سے دلچسپی لیتے کبھی نہیں دیکھا۔ اپنی بات دلیل سے پیش کرتے لیکن بڑی سادہ دلیل اور بالعموم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی بنیاد پر۔ ان کے ذریعے سیکڑوں نہیں، ہزاروں انسان قرآن کی دعوت اور جماعت اسلامی کے پیغام سے روشناس ہوئے اور کتنی ہی زندگیاں دین کے رنگ میں رنگ گئیں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ۔

محترم خان محمد ربانی صاحب کی دعوتی سرگرمیاں صرف ملتان تک محدود نہیں تھی۔ قرب و جوار کے علاقوں میں تو وہ جاتے ہی تھے، انھوں نے ملک میں ہر جگہ تحریکی پروگراموں میں شرکت کی اور درس و تقریر کے ذریعے اپنے پیغام سے کتنی ہی شمعیں روشن کیں۔ انگلستان بھی وہ تشریف لائے اور متعدد شہروں میں پروگرام کیے۔ اسلامک فاؤنڈیشن کے ایک ایک پراجیکٹ سے واقفیت حاصل کی اور اپنی بے شمار دعاؤں سے ہماری ہمت بڑھائی۔ ملک اور ملک کے باہر اور جماعت کے مرکزی پالیسی ساز اداروں میں ان کے کردار کے ساتھ اس امر کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ جنوبی پنجاب کے پورے علاقے میں تحریک اسلامی کے اولیں معماروں میں سے ہیں اور ان کی حیثیت بنیاد کے ان پتھروں کی سی ہے جو چاہے نظر نہ آتے ہوں مگر ساری عمارت انھی پہ کھڑی ہوتی ہے۔

ملتان میں جماعت اور جمیعت دونوں کو مستحکم کرنے میں ان کا بڑا بنیادی کردار ہے۔ پھر چودھری نذیر احمد مرحوم کے ساتھ مل کر جامع العلوم ملتان کا قیام اور ان کے بعد اسے ایک چھوٹے سے مکتب سے ایک عظیم درس گاہ تک ترقی دینے میں انھوں نے اپنے شب و روز صرف کیے اور اسی طرح کئی دوسرے صدقات جاریہ شروع کرنے کی سعادت حاصل کی۔

دعوتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ربانی صاحب ایک کامیاب سیاسی کارکن بھی تھے۔ ہر طبقے کے لوگوں سے ان کے تعلقات تھے اور ہر جگہ انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ تاریخ پاکستان کی تمام دینی اور سیاسی تحریکوں میں وہ پیش پیش تھے اور اس سلسلے میں بارہا قید و بند کی مشقت بھی ہنسی خوشی برداشت کی اور اس میں ایسے نازک لمحات بھی آئے کہ جس وقت وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے محبوب باپ کی میت کو غسل دے رہے تھے، بے رحم پولیس عین اس وقت گرفتار کرنے کے لیے پہنچی اور انھوں نے صرف اتنی مہلت لی کہ غسل کی تکمیل کر دیں۔ ادھر باپ کی میت سپرد خاک ہو رہی تھی اور ادھر بیٹا سوئے زنداں رواں دواں تھا۔

میں نے اپنے چالیس سے زیادہ سالوں پر پھیلے ہوئے دور رفاقت میں برادرم خان محمد ربانی کو ایک بار بھی غیر ضروری باتوں میں مصروف نہیں پایا۔ بس کام کی بات اور وہ بھی اتنے اعتماد، اتنے پیار اور اتنی سادگی کے ساتھ کہ دل سے نکل کر دل میں اتر جائے۔ میں نے انھیں کبھی غصے میں نہیں دیکھا، کبھی کسی سے تلخ کلامی تو کیا سخت کلامی کا بھی مرتکب نہ پایا۔ سخت سے سخت بات وہ بڑے ظرف سے پی جاتے اور بڑے ٹھنڈے انداز میں جواب دیتے جو پتھر کو بھی پانی کر دیتا۔ بات کرنے میں ان کا ایک خاص اسلوب تھا جسے الفاظ میں بیان کرنا بڑا مشکل ہے، اور مجھے اعتراف ہے کہ میں اس انداز کا قتیل ہوں۔ بڑی سے بڑی دلیل پر ان کا سادہ اور مٹھاس بھرا انداز چھا جاتا تھا۔

مولانا مودودیؒ سے ان کی محبت، اسلامی دعوت سے ان کی بے مثال وابستگی، جماعت اسلامی سے ان کی وفاداری، تحریکی ساتھیوں کے لیے ان کی شفقت، اپنے چھوٹوں کے لیے پیار اور سب سے بڑھ کر اپنے کام سے کام--- ان کی کس کس بات کو یاد کیجیے اور کس کس ادا کا ذکر کیجیے۔ شاید ماہر القادری نے کسی ایسے ہی کردار کا تصور کیا ہو گا جب انھوں نے کہا تھا:

میں لوحِ مہ و سال پہ وہ نقشِ وفا ہوں
مٹنے سے ابھرتا ہے مرا نام و نشاں اور

میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے محترم خاں محمد ربانی صاحب سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ وہ ان بزرگوں میں سے تھے جن سے ہم نے تحریک اسلامی کی روح تک رسائی حاصل کی اور جن کے نمونے میں ہم نے اپنے دور کے معیاری کارکن کی تصویر دیکھی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے اور جو چراغ انھوں نے روشن کیے ہیں تاابد روشن رہیں، دنیا کی ظلمات کو دور کریں اور ان کے لیے بھی ابدی روشنی کا سامان کریں۔ اور جو ساتھی ان جیسے رہنماؤں سے فیض حاصل نہ کر سکے اللہ تعالیٰ ان کی محرومی کا بھی کوئی سامان فرما دیں ورنہ ان کا حال یہی ہو گا کہ ؎ افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی۔

اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے زیر اہتمام

اجتماع عام

بسلسلہ پچاس سالہ تقریبات' کے موقع پر ادارہ مطبوعات طلبہ اپنے قارئین کے لئے درج ذیل کتب اور مصنوعات پیش کر رہا ہے۔

کتب

1- فہم القرآن (اول، دوم، سوئم) — سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
2- تحریک اسلامی کی کامیابی کی شرائط — سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
3- دعوت اسلامی اور اس کا طریقہ کار — سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
4- اسلامی قیادت — خرم مرادؒ
5- جنگی قیدی کے خطوط — خرم مرادؒ
6- کارکنوں کے باہمی تعلقات — خرم مرادؒ
7- منتخب احادیث — خرم مرادؒ
8- تعلیم الاسلام — مفتی کفایت اللہؒ
9- النبی الخاتم — سید مناظر احسن گیلانی
10- خطبات مدارس — سید سلیمان ندوی
11- تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام — مولانا قاری طیب
12- انسانیت موت کے دروازے پر — مولانا ابوالکلام آزاد
13- اخوان المسلمون کا نظام تربیت — ڈاکٹر یوسف القرضاوی
14- جدیدیت — حسن عسکری
15- مخلوط تعلیم — مسلم سجاد
16- زندہ تحقیق — مقصود احمد خان
17- انقلابی نظمیں — انجینئر رضوان صادق
18- غزلیں — صہیب اکرام
19- اذکار — ادارہ
20- میں نے جمعیت سے کیا پایا — خرم مراد، خورشید احمد
21- منتخب اشعار — امین اسد

بچوں کا ادب

22- گلدستہ قرآن — افتخار کھوکھر
23- انمول (گلدستہ حدیث) — عبدالرشید عاصم
24- شہباز (ناول) — عبدالرشید عاصم
25- منزل — ادارہ
26- کہانی ایک لڑکے کی — عبدالمحسن شاہین
27- خوشبو کا راز — ضیغم مغیرہ
28- آداب زندگی (بچوں کیلئے) — اختر عباس
29 بہانے باز — اختر عباس
30- عقل کہاں سے آئی — اختر عباس
31- دو آنسو — اختر عباس
32- آزادی کے سپہ سالار — ڈاکٹر رضوان ثاقب
33- راستے کا پتھر — ڈاکٹر رضوان ثاقب
34- بندر بندہ اور سرکار — ڈاکٹر رضوان ثاقب
35- زندہ باد مشغلہ — ڈاکٹر رضوان ثاقب
36- آؤ روزہ روزہ کھیلیں — ڈاکٹر رضوان ثاقب
37- تایا الٹی میٹم — ڈاکٹر رضوان ثاقب

مصنوعات

1- ہمقدم ڈائری
2- وال کیلنڈر
3- وال چارٹ (آٹھ اقسام کے)
4- اسٹیکرز (دعوتی، تحریکی)
5- سفری بیگ
6- ہینڈ بیگ
7- وال کلاک
8- پین بکس
9- پرچم جمعیت
10- پیپر بکس
11- بال پوائنٹس (دو اقسام کی)
12- پرس (دو اقسام کے)
13- کی رنگ (تین اقسام کے)
14- پوسٹر Long Live Jamiat
15- گول بیجز (پانچ اقسام کی)
16- انسگنیا
17- پٹی بیجز (پرچم جمعیت)
18- پوسٹر (اللہ ہمارا مقصود ہے، رسول ہمارے قائد ہیں قرآن ہمارا دستور ہے)
19- آڈیو، ویڈیو کیسٹ (25 اقسام کی)

1-اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور

اخبار امت

الجزائر: کیا ہو رہا ہے؟

مسلم سجاد

برادر اسلامی ملک الجزائر سے روز قتل و غارت کی خبر آتی ہے۔ اکا دکا نہیں' درجنوں نہیں' سیکڑوں بے گناہ عام لوگ' خاندان کے خاندان ذبح کیے جا رہے ہیں' زندہ جلائے جا رہے ہیں' ٹکڑے کیے جا رہے ہیں' عصمت دری کی جا رہی ہے۔ الجزائر کے عوام کو اور بین الاقوامی دنیا کو وہی خبر پہنچتی ہے جو خوف زدہ پریس کو اچھی طرح سنسر کرنے کے بعد شائع کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ گذشتہ ۶ برس میں ۵۰ صحافی ہلاک کیے جا چکے ہیں! بین الاقوامی ذرائع نے بھی اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور سرکاری ذرائع سے ملنے والی خبر پھیلانے پر اکتفا کر لیا جاتا ہے۔ قتل و غارت کی کوئی آزادانہ تحقیقات نہیں کی گئی ہیں۔ "زیادہ تر قتل دارالخلافہ کے جنوب میں قصبات کی ایک مثلث میں ہو رہے ہیں جہاں سرکاری افواج بھاری تعداد میں موجود ہیں۔ لیکن یہ فوجی تقریباً ہر روز رات کو آنے والے مسلح گروہوں کو روکنے کے لیے اور شہریوں کو قتل عام سے بچانے کے لیے اپنی بیرکوں سے برآمد نہیں ہوتے' جبکہ قتل و غارت ان کے بالکل پاس ہی (next door) ہو رہا ہوتا ہے" (دی اکنومسٹ' ۶ ستمبر ۹۷)۔

۱۹۹۲ کے عام انتخابات میں پہلے راؤنڈ میں اسلامک فرنٹ کی واضح کامیابی کے بعد' اسے حکومت بنانے کے جمہوری حق سے محروم کرنے کے لیے فرانس اور مغربی ممالک کی آشیرباد سے فوج میدان میں اتر آئی۔ بیشتر منتخب ممبران کو جیلوں میں بند کر دیا گیا اور تعذیب کا شکار بنایا گیا۔ ہر طرح کی پابندیاں لگا دی گئیں۔ اسلامک فرنٹ کے معروف رہنما عباسی مدنی اور بلحاج بھی جب ہی سے گرفتار ہیں۔ ساتھ ہی تشدد کی کارروائیاں شروع ہو گئیں۔ فرانس کے اخبار لی فگارو کے مطابق مئی ۹۷ تک ۳ لاکھ افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ بیشتر قتل ان علاقوں میں ہوئے ہیں جو فرنٹ کے مضبوط علاقے ہیں۔ حکومت ان کا الزام مسلح مزاحمتی گروہ (جی آئی اے) پر لگاتی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ حالات قابو میں ہیں اور وہ دہشت گردی کا خاتمہ کرنے کے قریب ہے۔ اکنومسٹ کے مطابق: "پہلی بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور دوسری بات بالکل غلط ہے"۔

مغرب جمہوریت کا علم بردار ہے لیکن الجزائر میں جمہوریت کے قتل پر اس نے کسی تشویش کا اظہار نہیں کیا۔ انسانی حقوق کا علم بردار ہے، لیکن اتنے بے گناہوں کے بے دردانہ قتل پر کوئی آواز نہیں۔ اسلامی قوتوں کی مخالفت کے لیے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ یہ جمہوریت دشمن ہیں اور حکومت میں آنے کے بعد حکومت چھوڑیں گے نہیں۔ لیکن جن سیکولر ستوں کے سر پر ان کا ہاتھ ہے، ان کا حال یہ ہے کہ ۳۰ سال مسلط رہنے کے بعد، جب عوام نے انھیں دوٹوں سے مسترد کر دیا، تب بھی وہ اقتدار سے چمٹے ہوئے ہیں اور اہل وطن کو خون سے نہلا رہے ہیں۔ فرانس اور مغربی ممالک کے لیے یہ کافی ہے کہ فوجی حکمرانوں نے جون ۹۵ میں ایک انتخابی ڈھکوسلے میں زیروال کو صدر منتخب کروالیا ہے۔ اب جون ۹۷ کے عام انتخابات میں صدر کی پارٹی کو اکثریت دلوانے کے لیے کھلی دھاندلی کی گئی۔ اخبار الاہرام نے ایک الجزائری افسر کے حوالے سے لکھا ہے کہ حقیقی نتائج بالکل مختلف تھے۔ صدر کی پارٹی کو صرف ۵۰ سیٹیں ملیں، جبکہ نتائج میں اسے ۱۵۵ دی گئیں۔ ۱۹۹۲ کے انتخابات کے بارے میں بھی اس وقت کی حکمراں پارٹی کے ذمہ دار نے اب انکشاف کیا ہے کہ اسلامک فرنٹ کو پہلے راؤنڈ میں ۲۴ سیٹوں سے محروم کیا گیا تھا ورنہ اسے پہلے ہی راؤنڈ میں مطلق اکثریت حاصل ہو جاتی (امپیکٹ، اگست ۹۷)۔

ان سب حقائق سے بھی الجزائر کی ناجائز حکومت کے سرپرستوں کی جمہوری حس پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ آئی ایم ایف حکومت کی معاشی پالیسیوں کی تحسین کرتا ہے، یورپی ممالک کے تجارتی وفود برابر آتے ہیں، بین الاقوامی کانفرنسوں کی میزبانی بھی ہوتی ہے، جیسے سب کچھ ٹھیک ہے۔

جولائی میں عباسی مدنی کو رہا کیا گیا تھا تو یہ امید ہوئی تھی کہ شاید ان انتخابات کے بعد حکومت کچھ اعتماد محسوس کر رہی ہے اور کوئی راستہ چاہتی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ اب امریکہ چاہتا ہے کہ معتدل گروہوں کو حکومت میں شریک کیا جائے۔ امریکہ کے تحقیقی ادارے بتا رہے ہیں کہ موجودہ صورت میں حالات قابو میں نہیں آئیں گے اور زیادہ انتہا پسند آیندہ اقتدار میں آکر مشکلات پیدا کر سکتے ہیں۔ خیال ہے کہ سابقہ روابط کی بنیاد پر اس مفاہمت میں نیلسن مینڈیلا کردار ادا کریں گے جن کے دورہ الجزائر کا اعلان ہوا ہے۔ ماضی میں افریقن نیشنل کانگریس کے نوجوانوں کو الجزائر میں تربیت دی جاتی تھی۔ دوسری طرف اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کوفی عنان نے پہلی بار پریس کانفرنس میں الجزائر کی صورت حال پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ "امید ہے کہ تشدد کے خاتمے کے لیے فریقین کی حوصلہ افزائی کے راستے تلاش کیے جائیں گے"۔ الجزائر کی حکومت نے اسے اندرونی معاملات میں مداخلت قرار دیا۔ عباسی مدنی نے عنان کے اس بیان کو خوش آمدید کہا اور اپنے ایک خط میں پیش کش کی کہ وہ فوری طور پر خوں ریزی بند کرنے کی اپیل کرنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن شاید یہ الجزائر کی حکومت کے منصوبے کے مطابق نہیں تھا۔ عباسی مدنی کو گھر پر نظربند کر دیا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ دنیا ایک گاؤں اور بستی بن گئی ہے، لیکن بستی کے ایک محلے میں کھلا ظلم ہو رہا ہے اور بستی والوں کو خبر نہیں۔ دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ یک طرفہ تصویر پیش کرتے ہیں کہ مسلم گوریلے کارروائی کر

رہے ہیں۔ مسلمان ممالک کے اخبارات بھی بلاتکلف یہی خبر نقل کرتے ہیں۔ اصل حقیقت کے گرد خاموشی کی دیوار ہے۔ بہت دیر ہو چکی ہے' اب وقت آگیا ہے کہ بے خبری اور خاموشی کی یہ دیوار توڑی جائے۔ حقائق معلوم کرنے کے لیے بین الاقوامی مشن الجزائر جائیں' آنکھوں سے دیکھیں اور لوگوں سے ملیں اور دنیا کو بتائیں کہ الجزائر میں کیا ہو رہا ہے؟

او آئی سی سے تو توقع نہیں ہوتی کہ وہ کوئی اقدام کرے' اس لیے کہ سب اپنے شیشے کے گھروں میں ہیں' لیکن امت مسلمہ کا درد رکھنے والے ادارے' اخبارات اور ایجنسیوں کو آگے بڑھنا چاہیے' اور اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ مغرب کو اس کا فرض یاد دلانا کافی نہیں۔ شکایت تو اپنوں سے ہے کہ سب کچھ اتنی خاموشی سے برداشت ہو رہا ہے۔ بین الاقوامی اداروں پر اتنا دباؤ پڑنا چاہیے کہ اقدام کرنے پر مجبور ہوں' اور الجزائر کی حکومت کو اجازت دینا پڑے۔ مغرب کو تو یہ فکر لاحق ہے کہ الجزائر میں اسلامی فرنٹ کو اقتدار مل گیا' اور تبدیلی کی لہر شروع ہو گئی تو ایک طرف مصر تک اور دوسری طرف بحیرہ روم پار کر کے ان کے علاقوں میں نہ آ جائے' اسی لیے وہ چھ سال سے ظالم اور ناجائز حکومت کا ساتھ دے رہے ہیں' لیکن مغرب کے باضمیر لوگوں کو بھی جگایا جا سکتا ہے۔ اصل فرض خود ان مسلمان ملکوں کا ہے' جہاں جمہوری اقتدار رائج ہیں اور جہاں مسلمانوں کے آزاد ادارے موجود ہیں۔ الجزائر جانے کے لیے وفد تیار ہوں چاہے حکومت انکار کرے' الجزائر کے سفیروں کو ہر جگہ جواب دینا پڑے کہ ان کے ملک میں شہری کیوں قتل ہو رہے ہیں؟ الجزائر کی صورت حال کو برداشت کیے جاتے رہنا' اب برداشت نہیں ہونا چاہیے۔

فلسطینی مقتدرہ: تہمت خود مختاری کی

محمد ایوب منیر

اسرائیلی وزیراعظم نیتن یاہو کا عرفات سے مطالبہ ہے کہ "چھوٹی مچھلیاں (sardines) نہیں' بڑی مچھلیاں (sharks) پکڑو۔ وہ نہیں' جو کارروائیاں کرتے ہیں' وہ جو منصوبے بناتے ہیں' ہدایات دیتے ہیں"۔۔۔۔ فلسطینی جاں بازوں کی کارروائی میں چند اسرائیلی شہریوں کی ہلاکت کے بعد' بین الاقوامی میڈیا یہی تصویر پیش کر رہا ہے کہ یہودی معصوم' پرامن ہیں' اور فلسطینی ظالم و دہشت گرد۔ صدر کلنٹن براہ راست ٹی وی پر آ کر عرفات سے مطالبہ کر رہے ہیں' وزیر خارجہ آل برائٹ موقع پر پہنچ کر دباؤ ڈال رہی ہیں کہ عرفات حماس کا قلع قمع کرے' ورنہ یہ نیک کام اسرائیلی افواج اس کے نام نہاد خود مختار علاقوں میں داخل ہو کر خود انجام دیں گی۔

اس سال مارچ اپریل سے' القدس کے مشرقی علاقے میں ۳۰ ہزار افراد کے لیے مکانات کی تعمیر کا آغاز کیا گیا۔ اوسلو معاہدے (اور جینوا کنونشن) کی اس کھلی خلاف ورزی پر اقوام متحدہ اسرائیل کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ ایک بے ضرر قرارداد پاس ہوئی اور وہ بھی امریکہ نے ویٹو کر کے اسرائیل کو کھلی چھٹی دے دی۔ اہل

فلسطین کے مسلسل احتجاج پر اسرائیلی اقدامات نے صورت حال کو سنگین کر دیا۔ ایک لاکھ فلسطینی جو محنت مزدوری کے لیے مقبوضہ علاقوں میں جاتے تھے' ان کا داخلہ بند کر کے انھیں فاقوں میں مبتلا کر دیا گیا۔ فلسطینی مقتدرہ کی ۴ کروڑ ڈالر کی ریونیو آمدنی کی ادائیگی روک دی گئی' اور یاسر عرفات پر حماس کو کچلنے کے لیے دباؤ بڑھایا گیا۔ اوسلو معاہدے کے بعد سے' فلسطینی ریاست میں حماس کے مجاہدوں اور ہمدردوں پر عرصہ حیات پہلے ہی تنگ کر دیا گیا ہے۔ اسرائیل اور اس کی پشت پناہ عالمی طاقتیں تماشا دیکھتی ہیں کہ انھیں خوش کر کے شاید مالی امداد کے کچھ مزید ٹکڑے حاصل کرنے کے لیے (جس کے وعدے زیادہ اور وفا بہت کم ہے!) عرفات کی پولیس اپنے ہی بھائیوں پر ظلم و تعذیب کا بازار گرم کیے ہوئے ہے۔ اب حالات بہت خراب ہوئے تو عرفات نے حماس کے رہنماؤں سے ملاقات کی' شاید اپنا وزن بڑھانے کے لیے۔ لیکن دوسری طرف خود عرفات اور فلسطینی ریاست کے دوسرے وزرا و افسران کی کرپشن' عیاشیوں اور اسرائیلی بنکوں میں اکاؤنٹ کی کہانیاں عام ہیں۔ ایسی قیادت مقابلے میں کس طرح کھڑی ہو! جو خود اپنی قوم کی نظروں میں غدار ہوں' اور دشمن کا ایجنڈا پورا کر رہے ہوں' ان کو دشمن وقعت کیوں دے' انھیں تو اپنا کام نکالنے کے بعد' منظر سے ہٹا ہی دیا جاتا ہے۔

فلسطین کی آزادی اور القدس الشریف کی بازیابی' عالم اسلام کا مسئلہ ہے' لیکن پہلے اسے صرف عربوں کا مسئلہ قرار دیا جاتا رہا اور اوسلو معاہدے کے بعد تو اسرائیل اور فلسطینی ریاست کا مقامی مسئلہ بنا دیا گیا ہے جس میں امریکہ نے عربوں کا ہمدرد بن کر اسرائیل کے مفادات کی دیکھ بھال کی ذمہ داری لے رکھی ہے۔ مصر کے حسنی مبارک اور اردن کے شاہ حسین کیا کام آسکتے ہیں۔ سعودی عرب اشارہ پا کر مالی امداد فراہم کر دیتا ہے (حال ہی میں شہری سہولتوں کے لیے ایک کروڑ ڈالر دیے ہیں)۔ دوسرے بڑے بڑے مسلم ممالک کے حکمران خود اپنے مسائل اور اپنے اقتدار کی بقا کے لیے امریکہ کی نظر کرم کے محتاج نظر آتے ہیں' وہ کسی پر کیا دباؤ ڈالیں اور کیا مدد کریں۔ پاکستان میں اسرائیل کی منظوری کا شوشہ چھوڑ کر' رد عمل سے اندازے لگائے جا رہے ہیں۔ اوسلو معاہدے کے بعد یہ دلیل ہاتھ آگئی ہے کہ جب خود فلسطینیوں نے صلح کر لی ہے' تو ہم حالت جنگ کیوں رکھیں۔ (جیسے کہا جاتا ہے کہ جب پاکستان خود بھارت سے مذاکرات کر رہا ہے' آموں کے تحفے بھیج رہا ہے' تو دوسرے مسلم ممالک بھارت سے کیوں بگاڑ مول لیں)۔ عرب اور افریقی ممالک کے اسرائیل سے سمجھوتے ہو رہے ہیں' تاکہ اسرائیل کو منڈیاں فراہم ہوتی رہیں۔ ترکی سے اسرائیل کے فوجی معاہدے ہیں اور مشترکہ مشقیں ہوتی ہیں۔

اوسلو معاہدے کے تحت قیام امن کے لیے جو بھلا برا عمل ہونا تھا' وہ اسرائیل کی خلاف ورزی اور ہٹ دھرمی' اور اس پر امریکہ کی پشت پناہی سے خطرے میں پڑ چکا ہے۔ جو نامنصفانہ شرائط طے کی گئی ہیں' ان پر امن کا کوئی امکان نہ تھا' اگر کچھ تھا' تو وہ بھی اب دھندلا گیا ہے بلکہ بعض مبصرین کے نزدیک تو جنگ بھی خارج از امکان نہیں۔ کسنجر نے کہا ہے کہ اسرائیل کی مسلسل سرپرستی مشرق وسطیٰ میں ہی امن کو برباد نہیں

کرے گی بلکہ پوری دنیا میں امریکی' دہشت گردی کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ سابق وزیراعظم رابن کی بیوہ نے آل برائٹ سے ملاقات سے قبل کہا: کبھی ہم یہودی بھی دہشت گرد تھے' اور ہمیں کوئی ختم نہ کر سکا۔ برطانوی فوج کی ہر طرح کی کوششوں کے باوجود ہماری سرگرمیاں جاری رہیں' ہمیں سمجھنا چاہیے کہ اس کا امکان بہت کم ہے کہ یاسر عرفات فلسطینی دہشت گردی ختم کر دے (روزنامہ ڈان' ۱۲ ستمبر ۹۷ء)۔

یقیناً اسرائیل اور امریکہ یہ سمجھتے ہیں لیکن وہ اسے ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ عرب ممالک کے مغرب نواز حکمران بھی دہشت گردی کے مسئلے پر امریکہ کے شانہ بشانہ ہیں۔ حال ہی میں مصر میں فوجی عدالت نے حکومت کا تختہ الٹنے کے الزام میں الجماعت الاسلامیہ کے ۶۸ افراد کو' جن میں ۴ خواتین بھی ہیں' عمرقید کی سزا دی ہے۔ یہ ترقی پسند' سیکولر اور نام نہاد لبرل حکومتیں نہ امن قائم کر سکی ہیں' نہ خوش حالی لا سکی ہیں' نہ اسرائیل کے مقابلے پر کھڑا ہونے کی ہمت رکھتی ہیں۔ ان کی مستقل اور کھلی ناکامی ان ممالک میں اسلامی قوتوں کا راستہ ہموار کر رہی ہے۔ فلسطین میں بھی مقتدرہ کی ۴ سالہ نااہل اور کرپٹ حکومت کے بعد حماس ہی امید کی علامت ہے۔

حماس کے مجاہدین اور فلسطین کے دوسرے بے گناہ شہریوں کے لیے اصل سہارا اللہ تعالیٰ کی ذات ہے' اور اس کے بعد امت مسلمہ کے وہ افراد اور گروہ ہیں جو حالات کا شعور رکھتے ہیں اور مستقبل کا ادراک کر سکتے ہیں۔ اہل فلسطین' اہل کشمیر کی طرح اور دنیا میں جہاں جہاں بھی مسلمان' دشمنوں سے نبرد آزما ہیں' ان کی طرح' اپنی آزادی اور حقوق کی لڑائی بے جگری سے لڑ رہے ہیں اور جان کے نذرانے پیش کر رہے ہیں۔ اگر امت بیدار ہو' ان کے مسئلے کو اپنا مسئلہ سمجھے تو یہ اتنی بڑی قوت ہے کہ ناجائز مسلط حکمرانوں کو بہا لے جائے' مسلمانوں کو دنیا میں آبرو مندانہ زندگی نصیب ہو' اور کوئی ان کی طرف بری نظر نہ اٹھائے۔

یاسر عرفات نے اوسلو معاہدہ کر کے' اور اسے آزما کر یہ واضح کر دیا ہے کہ اس طرح کی "صلح" بزدلی اور بے غیرتی کا راستہ ہے۔ عرفات اور اس کے حامی سوچیں تو سہی کہ ان سے کیا کام لیا جا رہا ہے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ دنیا کے دوسرے حصوں میں' امریکہ کی آشیرباد سے' کچھ دوسرے مسلمان حکمران یاسر عرفات بننے کے لیے تیار ہیں! تاریخ کا ایک سبق یہ بھی ہے کہ تاریخ میں' تاریخ سے سبق لینے کی روایت کوئی مضبوط روایت نہیں ہے۔ شاید اسی لیے تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے!

کتاب نما

عوام کی عدالت میں ' ایس ایم ظفر۔ ناشر: بیت الحکمت' مدینہ الحکمت' شاہراہ مدینہ الحکمت' کراچی'
صفحات: ۱۸۴۔ قیمت: ۱۵۰ روپے۔

یہ ایس ایم ظفر کے ۳۵ اخباری کالموں کا مجموعہ ہے۔ وہ ایک ممتاز وکیل ہیں۔ انھوں نے فساد اخلاق (کرپشن) کے خلاف' پاکستان کا یہ مقدمہ عوام کی عدالت میں نہایت مہارت اور جاں سوزی سے پیش کیا ہے۔ ان کے خیال میں کرپشن کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم کرپشن کی بدصورتی اور برائیوں کو پردے سے نکال کر عوام کے سامنے لے آئیں تاکہ عوام ایک دن اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ "اب ایک طویل اور ماہرانہ سرجری کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ یہ سرجری ایک مکمل احتساب ہو گا۔ اس میں اندھے قانون کے آگے' دیوانے اور جیالے' مذہبی اور ماڈرن جس نے بھی ملک کی دولت خود یا اپنے فیصلوں سے کسی کو دلوائی یا ضائع کی' کٹہرے میں کھڑا ہو گا اور سزاوار ہو گا۔ باوردی یا بے وردی' جس کے بھی ہاتھ رنگے ہوں گے ان کو رنگے ہاتھوں پکڑا جائے گا"۔

اخباری کالم کی کامیابی یہ ہے کہ اسے پڑھنا شروع کیا جائے تو آخر تک وہ خود اپنے کو پڑھوا لے اور اگلے دن نظریں اسی کالم نگار کی تحریر تلاش کریں۔ اس تعریف کے مطابق' ایس ایم ظفر کے یہ کالم نہایت کامیاب ہیں اور اپنے اندر مستقل قدر و قیمت رکھتے ہیں۔

ایس ایم ظفر کا کالم نگاری کا اپنا مخصوص انداز ہے جس میں وہ کہانیاں سناتے سناتے بڑی گہری بات کر جاتے ہیں۔ ایک کالم میں دو اطالوی وکیلوں کا ذکر ہے جنھوں نے معاشرے کی ۵ سو کرپٹ شخصیات کے خلاف عدالت میں مقدمات داخل کیے' چند ایک کو سزا ہو گئی تو ان کی دھوم مچ گئی۔ مگر ۱۹۹۲ میں ان میں سے ایک وکیل کو قتل کر دیا گیا' دوسرا' حملے میں زخمی ہوا۔ عوام سڑکوں پر آ گئے اور اب تقریباً ۴۰۰ مقدمات میں سزائیں ہو چکی ہیں (ص ۹۸-۹۹)۔ اسرائیل کی ایک عدالت میں نازی جرمنی کے دور کے ایک ملزم پر مقدمہ چلا' مگر اسے چھوڑ دیا گیا۔ کسی یہودی تنظیم کے قائد نے ہمارے کالم نگار سے کہا: "ملزم بے شک بری ہو جائے' لیکن مقدمہ ضرور چلنا چاہیے۔ اگر مجرم کو بغیر مقدمہ چلائے معاف کر دیا جائے تو یقین جانو کہ وہ جرم جڑ پکڑے گا اور مضبوط ہو گا"۔ ایس ایم ظفر نے شیخ مجیب الرحمٰن' حمود الرحمٰن کمیشن کے نامزد ملزم: غلام

مصطفیٰ کھر' آصف علی زرداری' الطاف حسین اور میر مرتضیٰ سب کے مشہور جرائم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "میری دھرتی کے سینے میں کون کون سے زہریلے پودے بو دیے گئے ہیں جو باقاعدہ پھل پھول رہے ہیں"۔

"اسلام نئی امت کی تلاش میں" کے زیر عنوان ایس ایم ظفر کہتے ہیں کہ انٹرنیٹ اور ای میل نے سرحدات کا تصور ختم کر دیا ہے۔ ایک نیا کلچر مرتب ہو کر ہر گھر میں پہنچ رہا ہے۔ اگر مسلمانوں نے برق رفتاری سے ہر طرح کی ٹیکنالوجی پر عبور حاصل نہ کیا تو "پھر اسلام زیادہ عرصے مسلمانوں کے درمیان نہ رہ سکے گا' ہم سے نالاں ہو کر نئی امت کی تلاش شروع کر دے گا" (ص ۱۶۷)۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ نکسن کے سیاسی مشیر مسٹر ونیس کو اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں معلومات کا کام سونپا گیا تو ایک دن انھوں نے کلمہ شہادت پڑھا۔ رینڈ کارپوریشن کے ریسرچ اسکالر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اصل اسلامی تہذیب' جس سے مغرب کا واسطہ پڑے گا' وہ مشرق وسطیٰ یا دوسرے معروف اسلامی ممالک کی تہذیب نہ ہو گی بلکہ وہ خود مغرب کے گھر میں پلی بڑھی اور جوان ہونے والی اسلامی تہذیب ہو گی"۔ مسلم امت کے درمیان قدرتی دولت اور افرادی طاقت کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابھی وقت ہے کہ ہم خود ہی وہ امت بن سکیں۔ (مسلم سجاد)

مقدمہ تعلیم' حکیم محمد سعید۔ ناشر: ہمدرد سنٹر' ناظم آباد' کراچی ۷۴۶۰۰۔ صفحات: ۷۶ (بڑی تقطیع)۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔

مجلس شوریٰ ہمدرد کی تجاویز کی روشنی میں تیار کردہ' حکیم محمد سعید صاحب کی اس تحریر میں پاکستان کے نظام تعلیم کی اصلاح کے لیے تجاویز دی گئی ہیں۔ یہ ایک جامع' وقیع اور ہمہ جہت دستاویز ہے۔ مختصر ہے لیکن اس میں ملک کو اخلاقی اور اقتصادی' ہر لحاظ سے رفعت و عظمت کی منزلوں تک لے جانے کا قابل عمل نقشہ موجود ہے۔ یہ تجاویز ایک ایسے دردمند دل کی آواز ہیں جو تعلیم سے قومی بے توجہی پر بے چین اور فکرمند ہے۔

وطن عزیز کے نصابات کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اکثر حالات میں یہ نظریہ اسلام سے متضاد' بعض حالات میں متصادم اور اپنی تاریخ سے بے نیاز ہیں۔ ان نصابات نے پاکستان کے ہر طالب علم کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس طرح "ملت واحدہ" کا تصور کالعدم ہو چکا ہے۔ نصاب کی انقلابی تدوین نو کے لیے چند اہم مثبت نکات پیش کیے گئے ہیں۔ اردو میڈیم اور انگلش میڈیم کے حوالے سے حکیم صاحب لکھتے ہیں کہ پاکستان میں سب سے زیادہ فساد اس انگلش میڈیم نے برپا کیا ہے اور طالب علم کو اسلام اور پاکستان دونوں

سے دور کر دیا ہے۔ اس تفریق کو لازماً اور حتمًا ختم ہونا چاہیے۔ ہر شہری کے لیے مرد ہو یا عورت' لازمی تعلیم کا نظام ضروری ہے۔

اس جامع رپورٹ میں پرائمری' وسطی' ثانوی' اعلیٰ پیشہ ورانہ اور سائنسی تعلیم کے لیے نصابی خاکے تجویز کیے گئے ہیں۔ پیشہ ورانہ تعلیم میں بھی دینی تعلیم کو لازمی کیا ہے۔ اساتذہ اور تعلیمی انتظامیہ کو فعال بنانے کے لیے متعدد تجاویز دی گئی ہیں۔ دنیا کے بیشتر ملکوں میں قومی آمدنی کا ۶ فی صد تعلیم پر خرچ ہوتا ہے۔ ہم ۲ فی صد سے اوپر نہیں آ رہے حالانکہ تعلیم میں سرمایہ کاری ایک نہایت منفعت بخش سرمایہ کاری ہے۔ ہماری ایک بدنصیبی یہ بھی ہے کہ اقرا ٹیکس کے اربوں روپے تعلیم پر خرچ نہیں کیے جاتے۔ اس رپورٹ میں مسجد سکول کی اسکیم تفصیل سے پیش کی گئی ہے۔ ایک اہم تجویز تعلیمی محتسب اور بااختیار وفاقی تعلیمی کونسل کی ہے۔

اس فکر کو عام کرنا ہے تو اس کی قیمت ۲۰ روپے سے زائد نہیں ہونا چاہیے۔ (م۔ س)

فتح الباری شرح صحیح البخاری ' حافظ ابن رجب الحنبلی۔ ناشر: مکتبہ الغرباء الاثریہ۔ المدینہ المنورۃ۔

حافظ ابن رجبؒ (عبدالرحمٰن بن احمد بن عبدالرحمٰن البغداوی الدمشقی الحنبلی۔ زین الدین ابو الفرج ۷۹۵ھ) کا شمار آٹھویں صدی ہجری کے جید ائمہ حدیث میں ہوتا ہے۔ آپ حافظ ابن القیم کے خاص تلامذہ میں سے تھے۔ اب تک آپ کی ۴۱ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ۱۳ مخطوطات مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ مزید ۲۶ کتابیں آپ سے منسوب ہیں مگر کہیں ان کی موجودگی کا علم نہیں۔

جامع ترمذی کی شرح آپ کی ایک اہم کتاب شمار ہوتی ہے جس کے مقدمے کی دو جلدیں چند سال قبل "شرح علل الترمذی" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ بقیہ کتاب دمشق پر تیمور لنگ کے حملے کے بعد آتش زدگی میں ضائع ہو گئی۔

ابھی کچھ عرصہ قبل مدینہ منورہ سے حافظ ابن رجب کی (مطبوعہ تصانیف میں) سب سے معیاری تصنیف (فتح الباری' شرح بخاری) کی دس جلدیں منظرعام پر آئی ہیں۔ دسویں جلد فہرست پر مشتمل ہے۔ حافظ ابن رجب اس شرح کو بس کتاب الجنائز تک لکھ پائے تھے کہ زندگی تمام ہوئی اور کتاب نامتمام رہ گئی۔ اس کتاب کے مختلف اجزا حجاز' شام' مصر اور کویت کے مختلف کتب خانوں میں بکھرے پڑے تھے۔ محققین کی ایک جماعت نے ان بکھرے موتیوں کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔

صحیح بخاری کی بہت ساری شرحوں کی اشاعت کے باوجود اس شرح کی ایک اہمیت ہے۔ حافظ ابن رجبؒ ' حافظ ابن حجرؒ سے متقدم ہیں' کہیں محسوس نہیں ہوتا کہ ایک نے دوسرے سے استفادہ کیا ہو۔ حافظ ابن

رجبؒ کی اپنی ایک شان ہے۔ امام ابن عبدالہادیؒ نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ زمانے کے عجائبات کا ایک نمونہ ہے۔ اور امام ابن مفلحؒ نے لکھا ہے کہ اس میں حققین کے بہت سے اقوال نقل ہوئے۔ امام ابن رجبؒ نے اس شرح میں چوتھی صدی ہجری سے پیشتر فقہا و ائمہ کے اقوال جمع کرنے کا خاص اہتمام کیا ہے۔ یہی اس شرح کا امتیاز ہے۔ کتاب و سنت کی تشریح میں یہ امت جس قدر عہد نبویؐ سے قریب ہو گی اسی قدر یہ حق پر ثابت قدم رہے گی، اور جوں جوں اس کی تشریح و تاویل عہد نبویؐ اور اس کے قریبی زمانے سے دور ہو گی اس میں تکلف اور تصنع کا غلبہ ہو گا اور دین ایک چیستان بن جائے گا۔ اہل علم کے لیے یہ کتاب ایک قیمتی تحفہ ہے۔ (عبدالمتین منیری)

نیاز فتح پوری: شخصیت اور فن، ڈاکٹر عقیلہ شاہین۔ ناشر: انجمن ترقی اردو، ۱۵۹ بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی۔ صفحات: ۴۹۸۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔

زیر تبصرہ کتاب ڈاکٹریٹ کا ایک مقالہ ہے جس میں مقالہ نگار نے اپنی ممدوح شخصیت کے محاسن، ادبی خدمات، فکری کارناموں اور گوناگوں "اولیات" کو ایک غالی مقلد کی سی ذہنیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ نیاز صاحب کے مقام و مرتبے، شہرت و قلم کاری کا ایک زمانہ معترف ہے۔ کچھ لوگوں کے لیے وہ ایک پسندیدہ شخصیت ہیں مگر بعض لوگ ان کے متعلق کچھ تحفظات رکھتے ہیں۔ اس ناگواری کی بنیاد، ان کی فکری آوارہ مزاجی اور اسلامی عقائد پر رندی و بے خودی کی سی کیفیت میں حملہ آوری ہے۔ اس کتاب کے مبصر کے لیے باعث تعجب ہے کہ کراچی یونی ورسٹی نے مدلل مداحی پر مبنی مقالے پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری دے دی ہے۔ مقالہ نگار نے نیاز صاحب پر سرقہ بازی کے الزام کا سرے سے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ پھر مرحوم نے اسلام اور ایمانیات پر جو نیش زنی کی، اسے کسی درجے میں بھی بحث کے قابل نہیں سمجھا۔ بلکہ ان کی قابل اعتراض تحریروں کو نظرانداز کر کے موصوف کی شخصیت میں رنگ بھرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

نیاز فتح پوری کے بارے میں ان کے ذہنی مرید بڑے فخر و انبساط سے یہ کہتے ہیں کہ یہی وہ شخصیت ہے، جس نے "خرد افروزی" اور "روشن خیالی" کی شمع روشن کی۔ احمد ندیم قاسمی صاحب فرماتے ہیں کہ ہم اور ہماری نسل نے نیاز ہی کے، جسارت و بغاوت پر مبنی خیالات سے حرارت حاصل کی ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اپنے دور کے تعلیم یافتہ افراد کے ذہنوں میں تجدد، بے دینی، تشکیک اور مذہب بیزاری وغیرہ کے ببول بونے میں نیاز فتح پوری کا خاصا نمایاں حصہ ہے۔ جمیل الدین عالی صاحب نے نیاز مرحوم کو "ہمہ جہت نابغہ" قرار دیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ مبالغہ آمیزی کرنے اور دوسروں کی تخلیقات کو اپنے نام سے چھپوانے والا فرد "بڑا" انسان نہیں ہو سکتا۔ ان کی تصنیف "تاریخ الدولتین" مشہور مستشرق جرجی زیدان کی عربی کتاب:

التمدن الاسلامی (ج ۴) کی تلخیص ہے۔ "نگار" کا مشہور "خدا نمبر" (۵۶ء) اصل میں محمد اسحاق صدیقی کی تحقیق و تالیف ہے۔ مصطفیٰ کامل مصری کی کتاب: المسئلۃ الشرقیہ کو مولانا مودودی نے نوعمری میں ترجمہ کیا' اشاعت کے لیے نیاز تک پہنچا' تو انھوں نے اسے اپنے نام سے شائع کر دیا۔ (ڈاکٹریٹ کی ڈگری پانے والی مصنفہ نے مصطفیٰ کامل کو مصطفیٰ کمال پاشا بنا دیا ہے' (ص ۳۳۹)۔ غالباً اس لیے کہ نیاز پر ان کے پیش رو محقق امیر عارفی نے بھی مصنف کا نام مصطفیٰ کمال پاشا ہی لکھا ہے)۔ اور کیا یہ حقیقت نہیں کہ نیاز کے جاری کردہ رسالے "جن" میں تحریریں مجنوں گورکھپوری کی ہوتی تھیں' مگر نام چھپتا تھا "نیاز فتح پوری" کا؟

یہ اور اس طرح کے دیگر بہت سے مبینہ "الزام" نیاز کی زندگی میں تسلسل کے ساتھ سامنے آئے' محترمہ کی ذمہ داری تھی کہ وہ اپنی محبوب شخصیت کے دامن کے ان چھینٹوں کو دھوتیں' یا پھر حقیقت کا اعتراف کر لیتیں۔ بہرحال اس مقالے سے نیاز فتح پوری کی زندگی اور ان کی علمی اور ادبی کاوشوں پر بہت کچھ معلومات سامنے آتی ہیں۔ (سلیم منصور خالد)

مغربی افریقہ کی تحریک جہاد' ڈاکٹر احمد محمد کانی۔ مترجم: ڈاکٹر ظفر الاسلام خان۔ ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اینڈ عربک سٹڈیز' پوسٹ بکس ۹۷۰۱ نئی دہلی۔ صفحات: ۱۰۱۔ قیمت: درج نہیں۔

یہ کتاب سوڈانی دانش ور اور مورخ ڈاکٹر احمد محمد کانی کی عربی کتاب "الجہاد الاسلامی فی غرب افریقیا" (قاہرہ ۱۹۸۷) کا اردو ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر کانی نائیجیریا کی احمدو بیلو یونی ورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے مختصراً یہ بتایا ہے کہ وسطی سوڈان میں اسلام کی آمد' سولھویں صدی میں مسلم مملکت برنو کے قیام اور اس خطے میں اسلام کی پیش رفت میں وہاں کے علما کے کردار نے راہ ہموار کی۔ خصوصاً شیخ عثمان بن فودی (۱۷۵۴-۱۸۱۷) کی اصلاحی کوششوں اور ان کی تحریک جہاد کا اس میں بڑا حصہ ہے۔ شیخ عثمان کی دعوت بہت سادہ اور عام فہم تھی: "ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ اصلاح اپنے آپ سے شروع کرے۔ خود کو فرائض کا پابند بنائے اور حرام کے ارتکاب سے دور رہے اس کے بعد اپنے گھر والوں اور اعزہ و اقارب کو تعلیم دے۔ پھر اپنے پڑوسیوں' بستی والوں اور علاقے کے لوگوں کو یہاں تک کہ پوری دنیا میں اسلامی تعلیمات کو عام کر دے"۔ ہوسا کے حکمرانوں کے معاندانہ رویے کے باوجود انھوں نے ۱۸۰۴ میں اس علاقے میں پہلی اسلامی مملکت خلافت صوکتو کے قیام کا اعلان کر دیا' اور گوناگوں مشکلات اور آزمایشوں کے باوجود وہ مستقل مزاجی سے اور حکمت کے ساتھ اصلاح و جہاد کی تحریک کو آگے بڑھاتے رہے۔ وہ صاحب قلم بھی تھے۔ سو سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔ انھوں نے اجتہاد کرتے ہوئے حکام کی تصاویر لگانے کو جائز قرار دیا۔ ان کے خیال میں ملک کے عمومی مفاد اور عوام کے دلوں پر اثرانداز ہونے کے لیے اس میں کوئی حرج نہ تھا۔ وہ عمر بھر مالکی

رہے اور فقہ مالکی کے مطابق ہی فتویٰ دیتے تھے۔ مگر تمام فقہی مسالک کو برحق سمجھتے تھے۔ تائید میں انھوں نے اسلامی تاریخ کے بعض واقعات پیش کیے ہیں۔ لکھتے ہیں: ایک دن خلیفہ ہارون الرشید نے امام مالکؒ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ان کے مسلک کو مملکت کا سرکاری مسلک قرار دے دیا جائے لیکن امام مالکؒ نے یہ کہتے ہوئے اس تجویز کو رد کر دیا کہ علما کا اختلاف اس امت پر خدا کی رحمت ہے۔ ہر شخص اللہ کی ہدایت کے مطابق اپنے خیال میں صحیح دلیل کی اتباع کرتا ہے اور سب کا مقصد اللہ ہے۔ امام مالکؒ ایک دوسری روایت میں کہتے ہیں: ہارون الرشید مجھ سے اکثر مشورہ کرتے کہ موطا کو کعبہ میں لٹکا دیا جائے اور لوگوں کو اس کی اتباع پر مجبور کیا جائے۔ میں کہتا: ایسا نہ کیجیے کیونکہ رسول اللہ کے اصحاب کے درمیان بھی جزوی مسائل میں اختلاف تھا۔ وہ ملکوں میں پھیل گئے اور ہر ایک حق پر تھا۔ اس پر ہارون الرشید نے کہا: اے ابو عبداللہ! اللہ تعالیٰ آپ کو مزید توفیق دے۔ شیخ عثمان کی اصلاحی کاوشوں اور تحریک جہاد نے مابعد کی افریقی اسلامی تحریکوں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اردو قارئین خصوصاً تاریخ کا ذوق رکھنے والوں کے لیے یہ ایک معلومات افزا کتاب ہے۔ (رفیع الدین ہاشمی)

مطبوعات موصولہ

☆ **پیغام قرآن**، مدیر: ڈاکٹر گل رحیم جوہر۔ ناشر: پیغام قرآن اوپن اکیڈمی، بنوں روڈ، ٹل، ضلع ہنگو، کوہاٹ۔ صفحات: ۳۱۴۔ قیمت: ۷۵ روپے۔ (سال بھر کے لیے مطالعہ قرآن کا ہفتہ وار منتخب نصاب۔ متن، ترجمہ اور تشریح)۔

☆ **گلستاں گلستاں**، نظر زیدی۔ ناشر: القمر انٹرپرائزرز، رحمن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۱۹۰۔ قیمت: ۱۲۰ روپے (مثنوی، رباعیات اور قطعات کا مجموعہ)۔

☆ **وڈیو جنریشن**، محمد الیاس انصاری۔ ناشر: فیروز سنز، لاہور۔ صفحات: ۳۱۰۔ قیمت: ۲۵۰ روپے۔ (پاکستان اور مشرق و مغرب کے دیگر ممالک میں ذرائع ابلاغ: ریڈیو، ٹیلی وژن، وی سی آر، وڈیو فلم، آڈیو کیسٹ، سینما، ڈش انٹینا، وڈیو گیم اور بدی کے فروغ میں معاون دیگر اشیا کے، معاشرے پر مہلک اور ہولناک اثرات و نتائج کی تفصیل--- مگر اس کا علاج؟)

☆ **نماز کا مکمل انسائیکلوپیڈیا**، مولانا نذیر الحق میرٹھی۔ ناشر: فضلی سنز، اردو بازار، کراچی۔ صفحات: ۵۱۹۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔ (نماز کے آداب، تعلیمات اور دیگر جملہ معلومات، دیدہ زیب طباعت میں)۔

☆ **نشہ اقتدار کی خرمستیاں**، مولانا محمد یوسف قریشی۔ ناشر: موتمر المولفین، جامعہ اشرفیہ، پشاور۔ صفحات: ۹۶۔ قیمت: ۳۰ روپے۔ (یزید بن معاویہ اور آفتاب شیرپاؤ کے سیاہ کارنامے)۔

مدیر کے نام

مولانا عبدالمالک، لاہور

سلیم الدین احمد صاحب (مدیر کے نام، ستمبر ۹۷) نے میرا جواب غور سے نہیں پڑھا۔ یہ سوال کافروں سے ہی متعلق ہے۔ سیاق و سباق سے بالکل واضح ہے۔ نہ مولانا مودودیؒ نے یہ لکھا ہے، نہ کوئی مفسر یہ لکھ سکتا ہے کہ یہ سوال مسلمانوں سے متعلق ہے۔ اصول فقہ کی کتب میں ضابطہ لکھا ہوا ہے کہ کفار تمام احکامات، نماز، روزہ وغیرہ کے مخاطب بالفروع ہیں۔ تفہیم القرآن کے جملے ہی اگر وہ غور سے پڑھ لیتے تو ان پر واضح ہو جاتا۔ درحقیقت جس طرح مومن کو جنت میں ایمان پر الگ جزا ہو گی اور اعمال صالحہ پر الگ، اسی طرح کفار کو کفر کی سزا الگ ملے گی اور شریعت کو ترک کرنے، نماز ترک کرنے، مسکینوں کو کھانا نہ کھلانے پر الگ۔ کفر کی مختلف انواع ہیں۔ ہر نوع پر الگ سزا ملے گی۔ دین پر نکتہ چینی کی الگ، قیامت کی تکذیب کی الگ۔ سزاؤں میں جرائم کی نوعیت کے لحاظ سے کمی بیشی ہو گی۔ واللہ اعلم!

پروفیسر عبدالجبار شاکر، لاہور

کلامی مسائل میں مولانا مودودی کا مسلک (ستمبر ۹۷) موضوع کے تعارف کی حد تک ایک اچھا مضمون ہے مگر اس میں عصری موضوعات پر سید مودودی علیہ الرحمہ کی متکلمانہ شان اور مقام پر کماحقہ گفتگو نہیں کی گئی۔ عصری مسائل میں خواہ وہ تہذیبی ہوں یا عمرانی، معاشی ہوں یا معاشرتی، سیاسی ہوں یا عدالتی، سید مودودی کے اسلوب اور استدلال کا ایک خاص مزاج ہے۔ انھوں نے کتاب و سنت میں ان موضوعات کی اصولی تعلیمات سے جو استدلال اور استخراج کیا ہے، یہی دراصل ان کی متکلمانہ صلاحیتوں کا بھرپور ادراک ہے۔ بیسویں صدی میں اسلامی ریاست کی ہیئت، تنظیم اور تشکیل کے ضمن میں ان کے مباحث خصوصیت سے ان کی متکلمانہ فکر کا اعجاز ہیں۔ فاضل مضمون نگار نے "مودودیات" کے دائرے میں ایک نئی جہت کو متعارف کرایا ہے جسے مزید پختہ کرنے اور نکھارنے کی ضرورت ہے۔

حبیب الرحمٰن قریشی، کراچی

ڈاکٹر عبدالحق انصاری لائق تحسین ہیں کہ انھوں نے اپنے وسیع مطالعے کی بنیاد پر کلامی مسائل میں مولانا مودودیؒ کے مسلک کی بہترین ترجمانی کی ہے، تاہم مابعد الطبیعیاتی امور میں کانٹ اور امریکی فلسفے کے مقابل رکھ کر عقل کی خامہ فرسائیوں کو مہمیز دینا، مولانا مودودی کی تحسین نہیں ہے کیونکہ قرآن و حدیث نے خود ایسے تمام مابعد الطبیعیاتی نظریات کے رد و قبول کی رہنمائی کی ہے کہ ان سے کون سے عملی مسائل حل ہوتے ہیں اور ان کے اثرات زندگی پر کیسے مرتب ہوتے ہیں۔

عبداللطیف ثاقب ' لاہور

ماہ ستمبر کا مہینہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی پیدائش اور وفات کا مہینہ ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اگر ان کی زندگی اور ان کے فکری اور دعوتی کام کے لحاظ سے مضامین اس ماہ کے شمارے میں شائع ہوتے۔

محمد صہیب ' بھارتی جیل سے

تقریباً ۴ سال قبل کشمیر کے لیے رخت سفر باندھا' زخمی ہو کر گرفتار ہوا۔ تیرہ مہینے انٹروگیشن سینٹر میں گذارے۔ اب یہاں پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت دو سال پورے کر رہا ہوں۔ ایک ذریعے سے دسمبر۹۶ سے اب تک کے ترجمان کے شمارے ملے۔ اللہ تعالیٰ خرم مراد صاحب کو اپنے سایہ رحمت میں نبیوں' صدیقوں اور شہدا صالحین کا ساتھ نصیب کرے۔ **کل کا روشن مستقبل اور آج کے سلگتے مسائل** (جنوری ۹۷) بہت پسند آیا۔ آپ کے ربیع الاول کے اشارات بھی۔ مولانا صدر الدین اصلاحی کی **راہ حق کے مہلک خطرے** آج کل پڑھی۔ ترجمان میں پوری آنا چاہیے۔

عبدالرحمٰن الکاف ' صنعاء یمن

رسول مقبولؐ نامی کتاب پر جو تبصرہ (جولائی ۹۷) شائع ہوا ہے وہ بڑی نادر اور کام کی چیز ہے۔ مختلف کتابوں اور رسالوں پر مولانا مودودیؒ کے تبصرے مختصر مگر مفید اور پرمغز ہیں۔ ان میں مختلف ادبی' دینی' ثقافتی اور اجتماعی رجحانات کی نشاندہی اور ان پر تبصرہ ہوتا ہے۔ مولانا کے تبصرے جمع کر کے مناسب شرح کے ساتھ شائع ہونے چاہییں۔ اس سے مولانا مودودیؒ کی ناقدانہ شخصیت اجاگر ہو گی۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہو گا کہ مولاناؒ کی عقابی نظریں زیریں لہروں (under currents) کا کس طرح مشاہدہ کر لیا کرتی تھیں۔ اس طرح مودودیؒ اور ترجمان متحدہ اور منقسم ہندستان کی دینی' فکری' سیاسی' دستوری' معاشی اور معاشرتی تاریخ کا مرقع بن کر نمودار ہوتے ہیں۔

میں بھی حیدر آباد دکن سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس لیے ترجمان کے خیریت آباد اور معظم جاہی مارکیٹ کے دفاتر اور اعظم اسٹیم پریس سے واقف ہوں۔ آپ کو جان کر خوشی ہو گی کہ میں اور مولاناؒ ایک ہی مادر علم--- دارالعلوم ہائی اسکول--- کے فرزند ہیں مگر ایک فرق کے ساتھ۔ مولانا جب دارالعلوم میں طالب علم تھے' اس وقت وہ دارالعلوم کالج تھا جس کے بانی اور پہلے پرنسپل مولانا حمید الدین فراہیؒ تھے۔ بعد میں سٹی کالج قائم ہونے کے بعد وہ صرف دارالعلوم ہائی اسکول رہ گیا۔ عمارت میرے زمانے تک وہی پرانی تھی۔ اس طرح میں فراہیؒ مودودیؒ اسکول کا نمایندہ ہوں اور اصلاحی فکر کا حامل بھی کیونکہ دو سال ثانوی درس گاہ جماعت اسلامی' رام پور میں تعلیم کے بعد دو سال مدرسۃ الاصلاح' سرائے میر' اعظم گڑھ میں تعلیم کی تکمیل کی ہے۔ میرے اساتذہ مولانا جلیل احسن ندویؒ' عروج قادریؒ' حامد علیؒ' ابواللیث اصلاحیؒ' صدر الدین اصلاحی' نظام الدین اصلاحی وغیرہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر' دنیا اور آخرت میں عطا فرمائے۔

۶۰ سال پہلے (اگست ۹۷) میں سکہ حالی اور سکہ کلدار کا ذکر آیا۔ اب لوگ شاید نہ سمجھتے ہوں' سابق ریاست نظام حیدر آباد کا مقامی سکہ حالی تھا اور وہاں اس انگریزی سکے کو جو سارے ہندستان میں رائج تھا' کلدار کہا جاتا تھا' کلدار حالی سے ۲ آنے زیادہ ہوتا تھا۔



دانتوں کی صفائی اور مسوڑھوں کی صحّت کے لیے انتہائی موثّر نباتاتی

مسواک ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ

اچھی صحت کا دار و مدار صحت، مند دانتوں پر ہے۔ اگر دانت خراب ہوں یا عدم توجہی کے باعث گر جائیں تو انسان دُنیا کی بہت سی نعمتوں اور لذّتوں سے لُطف اندوز نہیں ہوسکتا۔ زمانۂ قدیم سے صحتِ دندان کے لیے انسان درختوں کی شاخیں بطور مسواک استعمال کرتا آیا ہے۔ ہمدرد نے تحقیق و تجربات کے بعد دارچینی، لونگ، الائچی اور صحتِ دہن کے لیے دیگر مفید نباتات کے اضافے کے ساتھ "مسواک ٹوتھ پیسٹ" تیار کیا ہے جو دانتوں کو صاف اور سفید رکھنے کے ساتھ مسوڑھوں کو بھی مضبوط، صحت مند اور محفوظ رکھتا ہے۔

سارے گھر کا ٹوتھ پیسٹ

مسواک ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ

مسواک کے قدرتی خواص صحتِ دنداں کی مضبوط اساس

ہمدرد

مدینۃ الحکمۃ تعلیم سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ

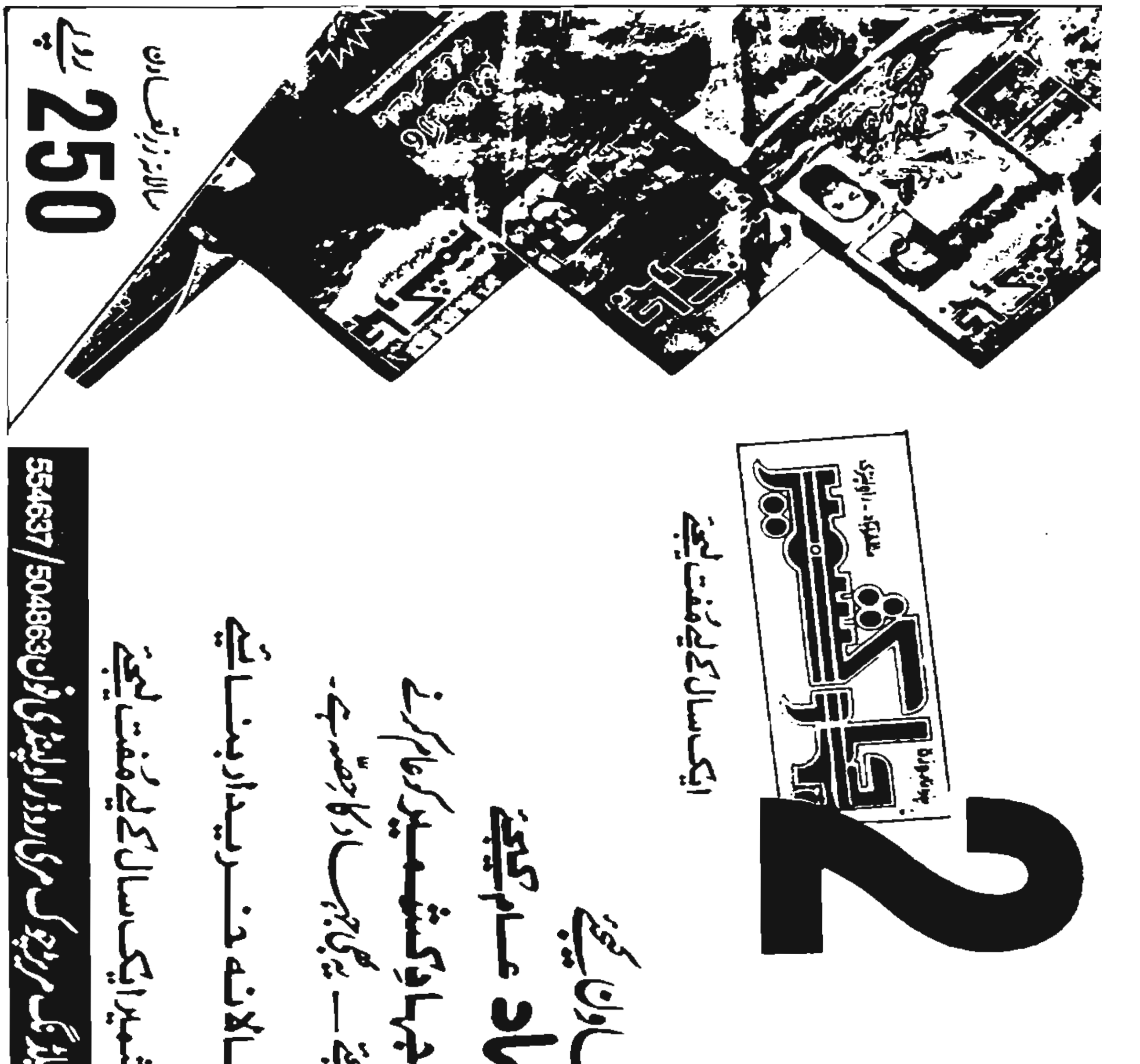
Adarts-HMPT-22/95

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵۔ اے ذیلدار پارک' اچھرہ لاہور سے شائع کیا

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ مجھے ان لوگوں میں سے بنا دے جو نیکی کریں تو خوشی محسوس کریں اور برائی کر گزریں تو استغفار کریں"۔

(مشکوۃ المصابیح)



اپنی تربیت کے لیے‘
تعمیر سیرت کے لیے‘

ارادہ موجود ہو تو
تعلیم و تربیت کی معمولی سی پھوار سے بھی
لہلہاتی فصل کھڑی ہو جائے گی

ارادہ موجود نہ ہو تو
تعلیم و تربیت کی بڑی سے بڑی بارش بھی رائیگاں جائے گی!

خرم مراد

(بندہ خدا)

ہماری مطبوعات

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی اعلیٰ ایڈیشن 300روپے
ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی سستا ایڈیشن 250روپے
تفہیم القرآن جلد اول
(سورۃ الفاتحہ تا سورۃ الانعام) 225روپے
تفہیم القرآن جلد دوم
(سورۃ الاعراف تا سورۃ بنی اسرائیل) 250روپے
تفہیم القرآن جلد سوم
(سورۃ الکہف تا سورۃ الروم) 250روپے
تفہیم القرآن جلد چہارم
(سورۃ لقمان تا سورۃ الاحقاف) 250روپے
تفہیم القرآن جلد پنجم
(سورۃ محمد تا سورۃ الطلاق) 225روپے
تفہیم القرآن جلد ششم
(سورۃ التحریم تا سورۃ الناس) 225روپے
تفہیم القرآن ڈیلکس سیٹ 1800روپے
تفہیم القرآن سپیشل سیٹ 1200روپے
فہم القرآن 18روپے
فہم القرآن (پارہ اول) 25روپے
تفسیر سورۃ الفاتحہ والبقرہ 45روپے
تفسیر سورۃ آل عمران 28روپے
تفسیر سورۃ النساء 35روپے
تفسیر سورۃ المائدہ 28روپے
تفسیر سورۃ الاعراف 30روپے
تفسیر سورۃ التوبہ 28روپے
تفسیر سورۃ یونس 21روپے
تفسیر سورۃ یوسف 13روپے
تفسیر سورۃ المومنون 16/50روپے
تفسیر سورۃ النحل 26روپے
تفسیر سورۃ بنی اسرائیل 28روپے
تفسیر سورۃ الانبیاء 18روپے
تفسیر سورۃ الحج 28روپے
تفسیر سورۃ النور 40روپے
تفسیر سورۃ الفرقان 18روپے
تفسیر سورۃ العنکبوت 18روپے
تفسیر سورۃ لقمان 10روپے
تفسیر سورۃ الاحزاب 30روپے
تفسیر سورۃ یٰسین 12روپے
تفسیر سورۃ الزمر 20روپے
تفسیر سورۃ الفتح 18روپے
تفسیر سورۃ الحجرات 18روپے
تفسیر سورۃ الرحمٰن 12روپے
تفسیر سورۃ الواقعہ 10روپے
تفسیر سورۃ الحدید 21روپے
تفسیر سورۃ المنافقون 10روپے
تفسیر سورۃ التحریم 10روپے
تفسیر تیسواں پارہ 60روپے
سیرت سرور عالمؐ (جلد اول) 150روپے
سیرت سرور عالمؐ (جلد دوم) 150روپے
خطبات حصہ اول (حقیقت اسلام) 24روپے
خطبات حصہ دوم (حقیقت صوم وصلوٰۃ) 15روپے
خطبات حصہ سوم (حقیقت زکوٰۃ) 6روپے
خطبات حصہ چہارم (حقیقت حج) 10/50روپے
خطبات حصہ پنجم (حقیقت جہاد) 6روپے
حقوق الزوجین 30روپے
الجہاد فی الاسلام 125روپے
خلافت وملوکیت 90روپے
سلاجقہ 28روپے
دکن کی سیاسی تاریخ 28روپے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مرتب: نعیم صدیقی۔ عبدالوکیل علوی
یہودیت قرآن کی روشنی میں 84روپے
نصرانیت قرآن کی روشنی میں 75روپے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مرتب: سید اسعد گیلانی
حکمت تبلیغ 80روپے
دعوت وتنظیم 30روپے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مرتب: اختر حجازی
قوموں کے عروج وزوال پر علمی
تحقیقات کے اثرات 36روپے
استفسارات حصہ اول 75روپے
استفسارات حصہ دوم 76روپے
تفہیمات حصہ چہارم 60روپے
خطبات یورپ مجلد 90روپے
خطبات یورپ نمبر 27روپے
دارالاسلام 125روپے

عبدالکریم عابد

مولانا مودودی کے سیاسی افکار 24روپے

سید قطب شہیدؒ

معرکہ اسلام اور سرمایہ داری [illegible]روپے

مولانا حیدر زمان صدیقیؒ

اسلامی نظریہ اجتماع 34روپے
اسلام کا نظریہ جہاد 24روپے
تعمیری انقلاب اور قرآنی اصول حکمت [illegible]روپے
عہد نبوت کے مسائل اور عصر حاضر 5روپے

مولانا جلیل احسن ندویؒ

سفینہ نجات 75روپے

سید اسعد گیلانی

رسول اکرمؐ کی حکمت انقلاب (مجلد) 120روپے
مشاہدات حرمین 24روپے
قرآن، رمضان اور محرم 21روپے
اسلام اور مسلم خواتین 30روپے
خطبات انبیاء 24روپے
تحریک اسلامی کی پہلی کتاب 35روپے
تحریک اسلامی کی دوسری کتاب 40روپے
تحریک اسلامی کے مراحل 10روپے
تحریک اسلامی کا تعارف 1روپیہ
اسلام اور سوشلزم 46روپے
دوش بدوش 46روپے
اسلامی نظریہ ادب 30روپے
امت مسلمہ سے خطاب 7/50روپے

ام فاروق

رسول اکرمؐ 48روپے

شبیر احمد منظر قدوسی

اقامت دین کا کام کہاں اور کیسے ہو؟ 5روپے

اختر حجازی

انسانیت کی موجودہ مشکلات اور سیرت رسولؐ 13/50روپے

ڈاکٹر محمد امین

عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون 60روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

رحمٰن مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور فون:- 7236652-7234014 ' پوسٹ کوڈ 54000

O.P.L. 236

Phone : 7587916
7585590

Monthly **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE.